ششماہی

ابلاغ

رانچی

اگست ۲۰۱۴ء تا جنوری ۲۰۱۵ء

جلد: ۲ ـ شمارہ: ۴

خصوصی شمارہ

بعنوان:

''اخلاقی قدروں کے فروغ میں اردو ادب کا حصہ''

مدیر

پروفیسر احمد سجاد

علمی وفنی اور ادبی جریدہ

ششماہی

ابلاغ

IBLAGH

Half Yearly Urdu Literary Magazine

اگست ۲۰۱۴ء تا جنوری ۲۰۱۵ء

Email:- markazadab1995@gmail.com

مدیر: پروفیسر احمد سجاد

(M) 09431359971

معاون مدیر: ڈاکٹر مظفر مہدی

کمپیوٹر کمپوزنگ: ارشاد احمد

(M) 09546517088

قیمت: -/Rs.200 (دوسو روپے)

مجلس مشاورت

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

ڈاکٹر قمر جہاں

ڈاکٹر محمد منصور عالم

ڈاکٹر سید احمد قادری

ڈاکٹر محمود شیخ

خط و کتابت کے لیے پتہ:

دفتر 'ابلاغ' ۲ک/۳، ہاؤسنگ کالونی، ڈاکخانہ آر، ایم، سی، سی، بریاتو، رانچی۔ ۸۳۴۰۰۹

Office'Iblagh' 2k/3, Housing Colony, P.O. R.M.C.C. Bariatu, Ranchi.834009

Ph.No. 0651-2540534

کسی بھی طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف رانچی کی عدالتوں میں ہی کی جاسکتی ہے۔

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ (ادارہ)

ناشر: ریسرچ اینڈ پبلیکیشنز ڈویژن، مرکز ادب و سائنس (تعلیمی و فلاحی) رجسٹرڈ ٹرسٹ)

بریاتو، رانچی، جھارکھنڈ۔

فہرست

صفحہ نمبر

مضراب　پروفیسر احمد سجاد　iv

افتتاحی کلمات　ادارہ　vi

موضوع پر وضاحتی نوٹ　xv

رپورٹ　xvii

نمبر شمار	مندرجات	مقالہ نگار	صفحہ نمبر
۱	ادب اور اخلاقیات	جناب اسلم بدر	۱
۲	اردو پر اسلامی تحریکات کا اثر	ڈاکٹر مظفر مہدی	۱۱
۳	تعمیر پسند افسانہ نگاری اور ابن فرید	پروفیسر ظفر حبیب	۲۴
۴	اردو کا تخلیقی مزاج	پروفیسر منصور عمر	۳۹
۵	جمہوریت کی اخلاقیات اور ادب	ڈاکٹر محمود شیخ	۵۵
۶	خواتین افسانہ نگار اور اخلاقی اقدار	ڈاکٹر کہکشاں پروین	۶۷
۷	اردو ناول میں اخلاقی قدریں	ڈاکٹر قمر جہاں	۷۴
۸	اردو افسانوں میں اخلاقی قدریں	ڈاکٹر سید احمد قادری	۸۳
۹	حیرتؔ فرخ آبادی کی اقداری شاعری	پروفیسر احمد سجاد	۹۵
۱۰	اردو تحقیق اور اخلاقی قدریں	ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی	۱۰۵
۱۱	سلمیٰ یاسمین نجمی ۔ اخلاقی قدروں کی ایک ممتاز فکشن نگار	روبینہ نسرین	۱۰۷

۱۲	اردو ادب پر تحریکات اسلامی کا اثر	جناب غلام محمد	۱۱۶
۱۳	اردو رباعیات کا فن اور اخلاقیات	جناب ظہیر غازی پوری	۱۲۱
۱۴	اردو کا صوفیانہ ادب	ڈاکٹر خالد سجاد	۱۲۹
۱۵	جھارکھنڈ کی اردو غزل، سب سے بڑی اخلاقی قدر لفظ 'خدا' کے حوالے سے	ڈاکٹر سرور ساجد	۱۴۴
۱۶	اخلاقی قدروں کے فروغ میں اردو ادب کا حصہ (نذیر احمد کے ناولوں کے حوالے سے)	ڈاکٹر جمال احمد	۱۴۸
۱۷	اردو غزل کے فروغ میں سیاسی تحریکات کا حصہ: اخلاقی اقدار کی روشنی میں (نئی اردو غزل اور سیاسی و سماجی و اخلاقی تناظر)	ڈاکٹر امتیاز احمد	۱۵۵
۱۸	اردو میں نعت گوئی۔ اسباب مقبولیت	ڈاکٹر محمد جمال مصطفیٰ	۱۶۲
۱۹	مراثی انیس میں انسان سازی کے عناصر (تربیت اخلاق و کردار کے حوالے سے)	ڈاکٹر حسن مثنیٰ	۱۶۶
۱۹	انفارمیشن ٹکنالوجی۔ لمحۂ فکریہ	ڈاکٹر طارق سجاد	۱۸۵
۲۰	مرکز ادب و سائنس۔ ایک مختصر تعارف		۱۹۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مضراب

''ابلاغ'' ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۳ء تک وقت پر نکلتا رہا اب بتیس (۳۲) برس کے ایک طویل وقفہ کے بعد ایک بہانے سے اس کا احیا ہو رہا ہے۔ اردو کے ادبی رسائل کی موت وحیات کا راز سب پر واضح ہے۔ اردو کے ''شائقین اور کتب فروش'' ہر شمارہ حاصل کرتے رہے مگر ادائیگی وعدۂ فردا پر ٹلتا رہا۔ بالآخر اس کی پوری پونجی ڈوب گئی تو رسالہ بند کرنا پڑا۔ ان دنوں کمپیوٹری کتابت وطباعت کے خوشگوار تکنیکی انقلاب نے تمام ہی زبان وادب کی طرح اردو کو بھی تمام تر نامساعد حالات کے باوجود ایک نئی توانائی بخشی ہے اس لیے اردو ادب وصحافت کی طباعت واشاعت میں بھی ایک نئی جان پڑ گئی ہے۔

اس دوران ارباب ابلاغ نے ایک تعلیمی وفلاحی رجسٹرڈ ٹرسٹ بنام ''مرکز ادب وسائنس'' کے زیر اہتمام تعلیمی وتکنیکی توسیعی مہم کا آغاز کیا جس کی ایک جھلک اس شمارے کے آخر میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اسی ٹرسٹ نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے ایک کل ہند ادبی سمینار بعنوان ''اخلاقی قدروں کے فروغ میں اردو ادب کا حصہ'' ۱۴/اپریل ۲۰۱۳ء منعقد کیا تو اس موقع پر شرکائے سمینار سے وعدہ کیا تھا کہ ان قیمتی مقالات کو بہر حال شائع کرنے کی سعی کی جائے گی۔ آخر اس دو سالہ سعیٔ لاحاصل سے مایوسی کے نتیجے میں مذکورہ ٹرسٹ کے پبلی کیشنز ڈویژن نے کسی طرح ان مقالات پر مشتمل ابلاغ کے ایک خصوصی شمارے کی صورت میں اشاعت کا بیڑہ اٹھایا۔

اس تاخیر کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بعض مقالہ نگاروں نے نظر ثانی کے بعد بھیجنے کے وعدے پر اپنا مقالہ واپس لے لیا مگر آج تک وہ وعدہ وفا نہ ہو سکا اس لیے مجبوراً ان سے محرومی پر صبر کرنا پڑا۔

انسانی زندگی اور اس کے علم وادب پر اخلاقی قدروں کی اساسی حیثیت کی جو گہری معنویت اور

اہمیت ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں اس کے باوجود بعض ''روشن خیال'' اہل قلم اس سے نظر بچا کے آگے بڑھنا ضروری خیال کرتے ہیں، اسی ترچھی نظر کے اسباب وعلل پر ''افتتاحی کلمات'' میں مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔ ملک گیر پیمانے پر ناقدین ومحققین نے اس اہم موضوع پر جو خیال انگیز روشنی ڈالی ہے وہ ہمارے ادبی سرمائے کا ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ اصولی ونظری پہلوؤں کے علاوہ تنقید، تحقیق، اصناف ادب، تحریکات، مذاہب اور بعض شخصیات مثلاً ڈاکٹر ابن فرید، نذیر احمد، حسین آزاد، حیرت فرخ آبادی اور پاکستان کی معروف فکشن نگار سلمیٰ یاسمین نجمی وغیرہ پر جو فکر انگیز حقائق پیش کیے گئے ہیں وہ منفرد نوعیت کے ہیں۔ آخر میں ٹرسٹ کی ہمہ جہت علمی وتکنیکی کاوشوں کی مناسبت سے ایک مضمون ڈاکٹر طارق سجاد کا بھی قابل غور ہے۔ یہیں پر مخلصین اردو سے گزارش ہے کہ وہ اپنے مشوروں سے نوازیں کہ ابلاغ کی اس ہمہ گیر علمی وادبی کاوش کو نفع ونقصان سے بے نیاز ہوکر کس طرح جاری رکھا جائے؟

ع　　صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

احمد سجاد

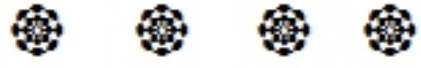

افتتاحی کلمات

بموقع قومی سمینار

بعنوان: ''اخلاقی قدروں کے فروغ میں اردو ادب کا حصہ''

زیر اہتمام واشتراک: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور مرکز ادب وسائنس

تعلیمی وفلاحی رجسٹرڈ ٹرسٹ، رانچی

مورخہ: ۱۴/اپریل ۲۰۱۳ء بروز اتوار

پروفیسر احمد سجاد

فاؤنڈر چیرمین ٹرسٹ

صدر سمینار جناب ڈاکٹر فیروز احمد صاحب، وائس چانسلر نیلامبر پیتامبر یونیورسٹی، ڈالٹن گنج، جھارکھنڈ اور ملک کے طول وعرض سے تشریف لائے ہوئے مہمانان کرام اور شہر وبیرون شہر کے تشریف فرما حاضرین محترم!

اس پروقار قومی اردو سمینار میں ہم ٹرسٹیز اور اسٹاف مرکز ادب وسائنس ٹرسٹ رانچی آپ سب کا تہہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں، خوش آمدید کہتے ہیں اور شکر گذار ہیں کہ ایک ایسے عہد میں جب مقامی سے بین الاقوامی سطح تک ہر جگہ اخلاقی قدروں کے بحران نے پوری انسانیت کو بیابان مرگ میں بھٹکنے پر مجبور کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس مسئلے نے ہمارے سامنے کئی جان لیوا چیلنجز کھڑے کر دیے ہیں چنانچہ ہم آپ اردو کے حوالے سے اس اہم ترین مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور وفکر کے لیے آج یہاں اکٹھا ہوئے ہیں۔

ہماری خواہش تو یہ تھی کہ اردو کے نامور ناقدین ومحققین نے اپنی عمر بھر کے فکر ومطالعہ کا نچوڑ اپنے مضامین ومقالات کی شکل میں جس طرح پیش کیا ہے ان سب کو سن کے ان پر بھرپور غور وبحث کی

جاتی۔ مگر وقت کی تنگی کے سبب مجبوراً اہم مقالات کی تلخیصی سماعت تک خود کو محدود کر رہے ہیں البتہ اس ٹرسٹ کی روایت رہی ہے کہ اس طرح کے قیمتی مقالوں کو کتابی شکل میں افادہ عام کی غرض سے شائع کیا جاتا ہے سو انشاءاللہ جلد انہیں مجموعہ کی شکل میں ضرور شائع کیا جائے گا۔ لہٰذا دوران سماعت جو سوالات ذہنوں میں پیدا ہوں انہیں آپ تحریری شکل میں نوٹ کر کے اپنے اور مقالہ نگار کے نام کی وضاحت کے ساتھ پیش فرمادیں تا کہ حسب موقع ان کے جواب دیے جاسکیں اور ان پر غور و بحث ہو سکے۔

محترم حضرات! فکری انتشار کی ستم ظریفی دیکھیے کہ زندگی اور ادب میں اخلاقی قدروں کو جو اساسی اہمیت حاصل ہے انہیں نام نہاد نظریاتی کج مج بحثوں کی نذر کر کے حاشیے میں اس طرح ڈال دیا گیا تھا کہ ان موضوعات پر بعض ادبی حلقوں میں گفتگو کو آؤٹ آف فیشن (Out of Fashion) سمجھا جانے لگا تھا۔

لیکن پچھلی صدی میں خانہ ساز ازموں نظریات اور کئی رجحانات نے دو جنگ عظیم، سرد جنگ اور مقامی تضاد و تصادم نے کروڑہا انسانی قتل و غارت گری کی ایسی شرمناک تاریخ رقم کی جس کی پوری انسانی تاریخ میں کوئی مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔ تشویشناک امر یہ ہے کہ نام نہاد جمہوریت، آزادی، مساوات، انسان دوستی، انسانی عظمت اور انسانی حقوق کے شور و غوغا اور سائنس و ٹکنالوجی کی حیرت انگیز وسرعت خیز ایجادات کے نتیجے میں خلا کی لامحدود وسعتوں میں چاند تاروں پر کمندیں ڈالنے، DNA, RNA اور جینوم کے بعد گوڈ پارٹیکلس کی دریافت اور Knowledge Based Society کے دعوؤں کے باوجود اس رواں صدی میں بھی بے حسی، بیدردی، بہیمیت اور درندگی میں جو دن دونی اور رات چوگنی اضافہ ہو رہا ہے اس نے اچھے اچھوں کے ہوش گم کر دیے ہیں۔ معروف ملحد فلسفی برٹنڈ رسل بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ

"اگر سائنسی تہذیب کو برتر تہذیب بننا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ معلومات

میں اضافہ کے ساتھ ساتھ حکمت میں بھی اضافہ ہو، حکمت سے میری مراد زندگی کی
غایات کا صحیح تصور ہے۔ مگر یہ وہ شے ہے جس کو سائنس مہیا نہیں کر سکتی''

وہ علم کم بصری، جس میں ہم کنار نہیں تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

مشکل یہ ہے کہ ''زندگی کی غایات کا صحیح تصور'' مشرق کے اقداری نظام ہی میں پایا جاتا ہے، مغرب کے مقداری نظام میں اسکا فقدان ہے اور المیہ یہ ہے کہ پچھلی کئی صدیوں سے مقداری نظام ہی کا ہر چہار سو غلبہ ہے جس کا مختصر ترین تاریخی پس منظر یہ ہے کہ برہمنیت، پاپائیت اور قیصریت کے گٹھ جوڑ اور ظلم و بربریت کے ردعمل نے بتدریج مغرب کو انحراف و بغاوت، الحاد اور اخلاق دشمن بنا دیا۔ اور مادیت، افادیت، لذتیت، لبرلزم، لادینی جمہوریت، قوم پرستی، اشتراکیت اور ماڈرنزم کی آندھی چلی تو نشاۃ ثانیہ کے بعد مغربی ادب میں رومانیت کی لہر سے جو فکری و ادبی انتشار پیدا ہوا وہ ایک مغربی ادیب و دانشور، عظیم ناقد اور شاعر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے لفظوں میں:

''ہوشمندی کے انقطاع کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس کی ہم کبھی بھی
اصلاح نہ کر پائے''

''ہوش مندی کے انقطاع کے اسی سلسلے'' نے انسانی ''اشرفیت'' کو پہلے تو مشکوک بنا دیا، پھر میکانکی، نامیاتی بلکہ ایبا کیڑا سے بھی آگے اسے غیر نامیاتی مادہ میں تبدیل کر کے جزوی تجربات، فروعی استنباط اور فارمولہ سازی کی وبا پھیلا کے مابعد الطبیعاتی، اخلاقی اور انسانی تصور کو مسخ کرنے کے بعد جملہ علوم و فنون کو بھی مسخ کر دیا۔ یوں کائناتی اور زندگی کی حرکی وحدت پارہ پارہ ہوگئی تو اس کی کوکھ سے ڈارون کی حیوانیت، مارکس کی شکم پرستی، میکڈوگل کی جبلتی، فرائیڈ کی جنسی، ایڈلر کی خود پرستی اور یونگ کی توہماتی تھیوریوں نے جنم لیا۔ تو پوپ نے خدا کے بجائے انسان پرستی پر زور دیا اور نٹشے نے تو خدا کی موت ہی کا اعلان کر دیا، اور مالرو (۱۹۴۵ء) نے خود انسان ہی کے مر جانے کی خوش خبری سنائی۔ نوبت

باایں جارسید کہ ہر سال چھ ماہ کے بعد نئے نئے فارمولے اورنظریے سامنے آنے لگے۔مثلاً واقعیت پرستی، زوال پرستی، علامت پرستی، سماجیت پرستی، اظہاریت، لاشعوریت، بے معنویت، فیمنزم، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات اورنت نئی دبستانی شوشہ بازیاں جن کے زیر اثر ایک عرصہ تک ہمارے اچھے خاصے نقاد اورادبا وشعرا نصف صدی سے آج تک عجیب وغریب احساس کمتری میں مبتلا رہے۔ڈاکٹر سید عبداللطیف کو اپنے زمانے میں غالب ایک گھٹیا درجے کے شاعر نظر آئے تو استاذی کلیم الدین احمد کو اردو غزل نیم وحشی صنف شاعری اور اردو تنقید معشوق کی موہوم کمر نظر آئی۔حسن عسکری اپنے دور اول میں اپنے ذہنی توازن کی برقراری کے لیے ہر ہفتہ ازراپاؤنڈ کے دو چار صفحات کی ''تلاوت'' کو ضروری قرار دیتے تو بودلیر اور ملارمے کو بلا وضو پڑھنا حرام سمجھنے لگے۔اس کے بعد تو جدیدیت کے زیر اثر بے سمتی و بے چہرگی نے نہ صرف افسانہ اور کہانی کا گلا گھونٹ دیا بلکہ اینٹی اسٹوری، اینٹی پوئٹری، آزاد غزل، نثری نظم اور الفاظ کی توڑ پھوڑ کی ادبی دہشت گردی شروع ہوگئی۔ادھر مغربی تہذیب کے استعماری مزاج، یکرخا سائنسی ترقی اور مادی دوڑ دھوپ اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے لفظوں میں برقیاتی اور تکنیکی تبدیلیوں نے معاشرہ کو دیکھتے ہی دیکھتے میڈیا سوسائٹی یا تماشا سوسائٹی میں بدل کے رکھ دیا ہے۔اب مابعد جدیدیت کا رشتہ کثیر قومی سرمایہ داری سے جڑ کے کالونزم کی جدید صورت گری کی جارہی ہے۔اور بہت سی جانی مانی صداقتوں کو جھٹلانے کی کوشش ہورہی ہے کہ موجودہ عہد کے مزاج کو تفرق آشنا قرار دیا جارہا ہے۔اسی لیے ان کے نزدیک معنی کا کوئی مرکز نہیں اور کثیر المعنویت پر کوئی پہرہ نہیں بٹھایا جاسکتا۔انسانی ذہن کو مابعد جدیدیت، بے باک، نڈر اور کشادہ بنانا چاہتی ہے چنانچہ ڈاکٹر شبنم سبحانی کے لفظوں میں تصنیف کو کنارے لگا کر کسی تخلیق کے متن کو قاری کے مکمل طور پر حوالے کیا جارہا ہے۔اس تضاد کا یہ حال ہے کہ ایک طرف تو یہ نظریہ واقدار اور حق و باطل کو جانچنے کے کسی طے شدہ پیمانے کے سخت مخالف ہیں تو دوسری طرف سماج اور زندگی کی اقدار سے اپنا رشتہ بنائے

رکھنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں ۔ ماضی، روایات، مذہبی اقدار اور نظریاتی اثاثے کو تہہ و بالا کر کے یہ ایک نئی اور خیالی دنیا کی تعمیر چاہتے ہیں ۔ مگر آج تک مابعد جدیدیت نے کوئی اعلیٰ درجے کا تخلیقی کارنامہ پیش نہیں کیا ہے ۔ البتہ انہدام، تغیر اور نئے تجربات کے زبانی دعوے مسلسل کیے جا رہے ہیں ۔

شکر ہے کہ بیسویں صدی کے تقریباً تمام ہی ازموں بشمول کمیونزم کا فکری و عملی جنازہ نکل چکا ہے اس لیے اہل نظر از سر نو غور و فکر کر رہے ہیں ۔ وہی ڈی، ایچ لارنس جو انسانی تعلقات کے ادب کی موت کا اعلان کر چکا تھا اب نئے اور جاندار ادب کے لیے مشرقیوں کو اسکا مشورہ ہے کہ مشرق، مغربی ادب کو پہلے اپنے اندر جذب کرے اور پھر اپنا راستہ خود ڈھونڈے ۔ مشرق کے لیے یہ زیادہ مشکل اس لیے نہیں کہ مغربی تہذیب کی بنیاد اگر طبیعات یا مادیات پر ہے تو مشرقی تہذیب کی بنیاد مابعد الطبیعات یا روحانیات و اخلاقیات پر ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی ادبیات کی بنیاد بالعموم مذہبی تعلیمات، اخلاقی اقدار، تہذیب و شائستگی اور اخلاق حسنہ پر مبنی ہے ۔

؎ شان خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آذری
اہل زمیں کو نسخۂ زندگی دوام ہے
خون جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری

چنانچہ مشرقی ادب و شاعری اور مذہب میں بہت سی قدریں مشترک ہیں ۔ ایلیٹ جب یہ کہتا ہے کہ ''ادب مسرت کے سوا کچھ اور دیتا ہے تو ''یہ کچھ اور'' حق و صداقت کی آفاقی قدروں کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ۔ یہ اخلاقی و تعمیری قدریں نیکی و روحانی پاکیزگی کو جلا بخشتی ہیں، ایثار، حریت، (انسانیت پرستی نہیں) انسانیت دوستی، محبت، خدمت اور محنت و مشقت پر آمادہ کرتی ہیں ۔ یہ تعمیری اقدار لازماً عقیدہ پر مبنی ہوتی ہیں اور پائیدار عقائد میں کائنات کی مافوق الفطری توجیہہ جزو لازم کی حیثیت رکھتی

ہے۔ چنانچہ تعمیری یا اخلاقی ادب دراصل خدا، کائنات اور انسان کے رشتوں کو ایک وحدت میں مدغم ہو کر اخلاقی و روحانی طرز احساس کا حامل بن جاتا ہے۔ یہ وحدت و ہم آہنگی ہی تشدیدی و تجیدی عمل کو مہمیز کرتا ہے اور احساس جمال کو تخلیق سے ہم آمیز کرتا ہے۔ اہل نظر خوب جانتے ہیں کہ حسن کے دو بنیادی عوامل یعنی ہم آہنگی (Hermony)اور تناسب (Proportion)جب تک ایک وحدت میں مدغم نہ ہو جائیں جمالیات کا ظہور ممکن نہیں۔ اسلام زندگی کو ایک حرکی وحدت قرار دیتا ہے اور اسلامی جمالیات دراصل نام ہے وحدت، تناسب، تعدیل، تسویہ اور توازن کا۔ مشہور انگریزی نقاد کلینتھ بروکس بھی فن کے عناصر اربعہ میں تہذیبی سرگرمیوں کے شعور کو لازمی قرار دینے پر مجبور ہوا کیونکہ تہذیب کا تصور مذہب یا خداپرستی کے تصور کے بغیر ناقص رہے گا۔ ایک انگریزی ناول نگار کا قول ہے کہ

> ''ادیب کو کسی ولی اللہ کی طرح دیانت دار اور ایمان دار ہونا چاہیے۔ وہ یا تو ایمان دار ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ جیسے عورت یا تو باعصمت ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔''

مغربی فکر و فلسفہ کے خداپرست ماہرین و مفکرین، آئین اسٹائن، سی، ای، ایم جوڈ اور ولیم جیمز وغیرہ خداپرستی اور روحانی و اخلاقی اقدار کی ضرورت اور اہمیت کو تسلیم کر چکے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ادب میں حسن، خیر اور صداقت کی دینی بنیادوں کی اہمیت ہمیشہ مسلم رہی ہے۔

اسلامی ادبی روایات کا امتیاز یہ ہے کہ وہ فنی لوازم کے اتمام اور اقداری عناصر خیر کے احترام کی منزلوں سے گزرتی ہوئی ماورائی عظمتوں تک پہنچتی ہیں۔ حضرت حسانؓ بن ثابت، رومیؒ و جامیؒ، حافظؒ و سعدیؒ، نیز میرؒ، دردؒ، غالبؒ، اقبالؒ، ماہر القادریؒ، نعیم صدیقیؒ، حفیظ میرٹھیؒ، سہیلؒ احمد زیدی، عزیزؒ بگھروی وغیرہ اسی سلسلۃ الذھب کی مختلف کڑیاں ہیں۔

تعمیری و اخلاقی اقدار جملہ علوم و فنون کو حیوانی سے انسانی اور انسانی سے روحانی صداقتوں کو

ہمکنار کرتی ہیں کیونکہ علما وصوفیا اور اسلامی دانشوروں نے تربیت وتزکیہ کے ذیل میں نفس مطمئنہ، نفس لوامہ اور نفس امارہ اور حقوق النفس کے تحت، معرفت نفس، احتساب نفس، تربیت نفس اور عزت نفس جیسے موضوعات پر اتنا بڑا علمی و عملی ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے کہ اس کی کوئی نظیر دنیائے علم وادب میں پیش کرنی مشکل ہے اخلاقیات کے ذیل میں: اخلاق ناصری، اخلاق محسنی، اخلاق جلالی اور گلستاں، بوستاں کی کلاسیکی اہمیت سے ایک دنیا واقف ہے۔ٹی ،ایس ،ایلیٹ (۱۹۵۶۔۱۸۸۸ء) تسلیم کرتا ہے کہ

''ادب (یہاں صرف تخیلی ادب مراد ہے) ہمیشہ کسی نہ کسی اخلاقی معیار ہی پر پرکھا جاتا ہے اور ہمیشہ پرکھا جاتا رہے گا۔'' (ایلیٹ کے مضامین ۔ ترجمہ جمیل جالبی ۲۳)

اردو کے مشہور ناقد آل احمد سرور کا یہ قول بھی یادگار ہے:

''ادب میں جب بھی مذہبی اقدار اور اخلاقی بنیادوں پر استوار تہذیبی ڈھانچہ کا نقشہ پیش کیا گیا ہے تو تاریخ کے صفحات پر لازوال اور عہد ساز بن گیا ہے۔''

(ادبیات محمود ۔اول ۔۲۳)

ان حقائق کے علاوہ ایک تاریخی صداقت یہ بھی ہے کہ تقریباً تمام ہی مذاہب کی مقدس کتابیں مہابھارت، رامائن، بائبل، قرآن یا گروگرنتھ صاحب سب کی سب آج بھی مذہبی کے ساتھ ہی ساتھ دنیا کی بیش قیمت ادبی شاہکار تسلیم کی جاتی ہیں۔

اردو زبان وادب کا آغاز وارتقاہی صوفی سنتوں، بزرگوں اور ولیوں کی کاوشوں سے ہوا۔اردو کے جملہ شعری ونثری کارناموں پر خدا پرستی واخلاق مندی اور دعوتی وتبلیغی اثرات کا ہر اعتبار سے غلبہ ظاہر وباہر ہے۔مورخین نے نشان دہی کی ہے کہ مجدد الف ثانی کے اثرات سے اردو شاعری اور تحریک شاہ ولی اللہ سے اردو نثر گہرے طور پر متاثر ہے۔مولوی خرم علی بلہوری، قاضی علاؤ الدین بگھروی، حکیم مومن خاں مومنؔ ، شاہ اسمٰعیل شہید کی تقویۃ الایمان، مفتی صدرالدین آزردہ (شاگرد شاہ عبدالعزیز)، کرامت علی جونپوری کی دعوت واصلاح پر ۴۴ کتب، مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی

عظیم آبادی وغیرہ کے کارنامے تاریخ کے انمٹ نقوش ہیں۔مزید یہ کہ قرآن وحدیث،تاریخ وسیر وغیرہ کی اہم کتب کے ترجے اور طبعزاد تفہیم القرآن، سیرت النبی وغیرہ کے علاوہ مختلف مذاہب کی مقدس کتابیں اور ان پر جو قیمتی لٹریچر کا اردو میں دو سو سالہ ذخیرہ ہے اسکی مثال ملک کی کوئی دوسری زبان پیش نہیں کرسکتی۔

ان کے علاوہ تحریک جدوجہد آزادی پر نظم ونثر صحافت اور خطابت کے جو عدیم النظیر کارنامے اردو میں ہیں وہ بھی اپنی مثال آپ ہیں۔سرسیدؔ، حالیؔ، شبلیؔ، ڈپٹی نذیر احمد، حسین آزادؔ، عبدالحلیم شررؔ، خواجہ حسنؔ نظامی اور اکبرالہ آبادی، اقبالؔ اور مولانا ابوالکلام آزادؔ وغیرہ نے حالی کی یاسیت سے آگے بڑھ کر خود شناسی وخود اعتمادی اور سرفروشی کی جونئی تاریخ رقم کی ہے اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

اور اکبرؔ و اقبالؔ کی نظمیں اور اشعار آج ایک صدی پرانے ہونے کے باوجود اسکا جادو برصغیر کے سر پر چڑھ کے بول رہا ہے۔بیشک اردو شاعری کی تاریخ میں عمدہ سے عمدہ شاہکار نظموں کی تخلیق ہوئی ہے لیکن اقبال کی مسجد قرطبہ اور ذوق وشوق وغیرہ جیسی نظموں کا آج بھی کوئی جواب نہیں۔وجہ ظاہر ہے کہ تعمیر پسند اور اخلاقی اقدار کے حامل تخلیق کار جوش حیات، مثبت انداز فکر اور اعلیٰ انسانی قدروں کو فروغ دے کر مسرت کے ساتھ بصیرت کا بھی سامان فراہم کرتے ہیں۔وہ الحادی ادیبوں کی مادہ پرستی، جبریت، اشتہاریت نیز بے چہرگی و بے سمتی اور ابتذال کے بجائے پاکیزگی جذبات وخیالات، پختگی فکر، قوت استدلال، وسعت معلومات، عرفان واخلاص، جمالیاتی انداز، جدت واپج اور موثر اسلوب سے کام لیتے ہیں کیونکہ تعمیری تخلیق کار توحید اور وحدت آدم کی بنیاد کے ساتھ ماورائیت، اخلاق کے ساتھ روحانیت، رجائیت، عظمت آدم، مستضعفین کی خیر خواہی اور مساوات انسانی کے مخلص ترین علم

بردار ہوتے ہیں۔اسی وجہ سے اردو ادب کا بیشتر حصہ اخلاقی اقدار سے مالا مال تاریخ میں ظاہری و باطنی، ذہنی و روحانی، جذباتی و جمالیاتی، مادی و ماورائی عوامل کے متوازن اور حسین امتزاج کی روایت سے ہمیشہ درخشاں رہی ہے۔

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عین حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگ دوام اے ساقی

سیمینار کی قومی نوعیت اور موضوع کی ہمہ گیری کے پیش نظر شرکائے سیمینار کی فہرست سازی میں دونوں پہلوؤں کا بطور خاص خیال رکھا گیا چنانچہ بلا امتیاز ادبی مکتبۂ فکر، مرد و خواتین، ناقدین و محققین، تخلیق کار و دانشوران کی شمولیت کو ممکن بنانے کی سعی کی گئی۔یہی وجہ ہے کہ اردو ادب و تاریخ کے مختلف عنوانات اور شعر و نثر کی مختلف اصناف پر ماہرین کی سترہ نگارشات کا حصول ممکن ہوا جنھیں مقالہ نگاروں نے خود پیش کیا۔توقع ہے کہ یہ مجموعہ ادب دوستوں کے لیے فکر انگیز ہوگا۔

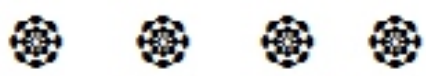

موضوع پر وضاحتی نوٹ

''اخلاقی قدروں کے فروغ میں اردو ادب کا حصہ''

ادب اصلاً فکر وفن کے حسین امتزاج کا دوسرا نام ہے مگر عام طور پر اس کا دائرہ کار واثر لسانی، تفریحی اور چند تنقیدی وتحقیقی موضوعات تک محدود سمجھا جاتا ہے جب کہ دنیا کے ہر ادب کی طرح اردو شعر ونثر کی تاریخ شاہد ہے کہ اس نے ہر دور میں ملک وملت اور انسانیت کے ہر نشیب وفراز اور برے بھلے میں ہماری تہذیبی زندگی کے لیے پشتیبان کا کام کیا ہے کیونکہ آغاز سے ہنوز اردو ادب کا فطری مزاج اخلاقی رہا ہے مزید یہ کہ ادب کا سرچشمہ بھی خیر وشر کی قوتوں کی کشمکش سے پیدا ہونے والا وہ کرب ہے جو من کی عمیق گہرائیوں میں اتر کر رگ وجاں کا جزو بن کر بے اختیار تراوش قلم سے صفحۂ قرطاس پر پھیل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے ادبی ذخیرے میں ہر مذہب وملت، نظریہ اور رجحان اور تحریک نے گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ چنانچہ اس برصغیر میں مختلف مذاہب وتحریکات کی تبلیغ واشاعت کے علاوہ تبدیلی وانقلاب کا سب سے بڑا نقیب بھی اردو ادب رہا ہے۔

آج سارے عالم میں سائنس وٹکنالوجی کی برکات کے ساتھ تہذیب واخلاق کا جو عظیم بحران پیدا ہوا ہے اس ماحول میں اردو ادب اپنے ماضی وحال کی روشن تاریخ سے آنے والی نسل کو بہت کچھ دے سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ مشاہیر ادب وتنقید اس پہلو سے اپنے مطالعہ وتحقیق سے ہمیں مستفیض فرمائیں۔

ہمیں پوری توقع ہے کہ اس کلیدی عنوان کے ذیلی موضوعات پر قیمتی مقالات پیش ہوسکیں گے مثلاً:

(۱) ادب اور اخلاقی قدریں　　(۲) اردو شاعری میں اخلاقی قدریں

(۳) اردو مراثی کی قدری اہمیت　　(۴) اردو ناول میں اخلاقی قدریں

(۵)اردواور بھکتی تحریک (۶)اردو کی نعتیہ شاعری

(۷)اردو کا صوفیانہ ادب (۸)اردو میں مختلف مذاہب کا بنیادی لٹریچر

(۹)اردو اور گنگا جمنی تہذیب (۱۰)جدوجہد آزادی میں اردو کا حصہ

(۱۱)مذاہب عالم اور اردو (۱۲)اردو اور قومی یکجہتی

(۱۳)اردو پر اسلامی تحریکات کا اثر (۱۴)اردو کا تخلیقی مزاج

(۱۵)اردو پر مختلف سیاسی تحریکات کا اثر (۱۶)اردو میں انسانی حقوق کی بازیافت

(۱۷)اردو رباعی اور اخلاقیات (۱۸)اردو مثنوی میں اخلاقی اقدار

(۱۹)اردو تنقید میں اخلاقی قدریں (۲۰)اردو افسانے میں اخلاقی قدریں

(۲۱)اردو پر مغرب کی ہمہ گیر اثرات (۲۲)اردو کا جدید ادب اور اخلاقیات

(۲۳)خواتین افسانہ نگار اور اخلاقی اقدار (۲۴)اردو کا صوفیانہ ادب

(۲۵)اردو ناول میں اخلاقی قدریں

رپورٹ

کل ہند اردو سمینار

کلیدی موضوع: ''اخلاقی قدروں کے فروغ میں اردو ادب کا حصہ''

بتعاون: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

زیر اہتمام: مرکز ادب و سائنس تعلیمی و فلاحی رجسٹرڈ ٹرسٹ

زیر صدارت: ڈاکٹر فیروز احمد صاحب، وائس چانسلر نیلامبر پتامبر یونیورسٹی، ڈالٹن گنج

مہمان خصوصی: شری سبودھ کانت سہائے، ایم، پی، رانچی و سابق وزیر کابینہ حکومت ہند

مہمان اعزازی: فادر ایل، اگناسی موتھو، ڈائریکٹر LIFE ستیہ بھارتی رانچی، اور

جناب نورالاسلام صاحب فاؤنڈر سکریٹری الامین مشن، مغربی بنگال۔

مورخہ ۱۴/اپریل ۲۰۱۳ء کو دس بجے دن میں دونوں پروگرام کا افتتاح کوسز تھیولوجیکل ہال، مین روڈ رانچی میں ہوا۔

پروفیسر احمد سجاد صاحب فاؤنڈر رچیرمین ٹرسٹ نے چند منٹ کے مختصر افتتاحی کلمات میں بتایا کہ آج کی تاریخ اس اعتبار سے نہایت مبارک ہے کہ آج ہی یوم امبیڈکر ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ڈاکٹر امبیڈکر نے عمر بھر ملک کی سماجی زندگی کو اخلاقی قدروں کا پابند بنا کر ذات پات، اونچ نیچ اور چھوت چھات کو دور کرنا چاہا اسی طرح جس طرح گاندھی جی نے ملک کی سیاست کو اخلاقی قدروں کا پابند بنانا چاہا۔ اسے حسن اتفاق ہی کہا جائے گا کہ آج کے اس قومی سمینار کا موضوع بھی ''اخلاقی قدروں کے فروغ میں اردو ادب کا حصہ'' کلیدی موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔

پروفیسر احمد سجاد صاحب نے مہمانان محترم اور اردو کے نامی گرامی ناقدین و محققین، اساتذہ اکرام اور دانشوران کرام کو ادب و احترام کے ساتھ خوش آمدید کہا اور سندیافتہ طلباو طالبات اور ان کے سرپرستوں کو دلی مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس امر پر طمانیت کا اظہار کیا کہ عصر حاضر کے علمی دھماکے اور ملک میں بنتی اور بڑھتی ہوئے Knowledge Based Society کو مزید آگے بڑھانے میں تھوڑا سا تعاون اور یوگ دان یہ ٹرسٹ بھی کر رہا ہے۔ٹرسٹ کی علمی و تحقیقی کتابوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ''بندۂ مومن کا ہاتھ'' کی جو پذیرائی کلکتہ سے دہلی اور ممبئی و مدراس سے اورنگ آباد نیز ویلوریا وانیم باڑی تک جو مجلسیں منعقد ہوئیں انکا تذکرہ کیا۔

آج کے سمینار کے مہمان خصوصی ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین اور مجوزہ صدر پروفیسر عبدالحق نیز ایم، ڈبلیو انصاری آئی، پی، ایس سکریٹری مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن عین وقت پر اپنی شدید علالت اور ڈاکٹر کی ممانعت کی وجہ سے حاضرین جلسہ سے معذرت خواہی کی جو اپیل کی تھی اسے سجاد صاحب نے پیش کیا اور بتایا کہ یہ معزز حضرات آئندہ کے پروگرام میں اس غیر حاضری کی تلافی کا وعدہ کیا ہے۔

انجینئر طارق سجاد صاحب سکریٹری مرکز ادب و سائنس ٹرسٹ نے اپنی رپورٹ کو پاور پوائنٹ پر اختصار سے پیش کرتے ہوئے ٹرسٹ کے چاروں شعبوں ادبیات، مذاہب کا تقابلی مطالعہ، تحقیق و اشاعت اور کریئر گائیڈنس اینڈ ٹریننگ اور ٹرسٹ کے زیر اہتمام چلنے والے آٹھوں انسٹی ٹیوٹ اور درجنوں چلنے والے کورسیز کے علاوہ جھارکھنڈ کے ۲۰/اضلاع میں اس کی جو شاخیں چل رہی ہیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے آج کے جلسہ کی معنویت و اہمیت کو پیش کیا۔

مہمان خصوصی شری سبودھ کانت سہائے صاحب نے ٹرسٹ کی ڈوکیومینٹری فلم بعنوان ''قدم بقدم'' کی اجرائی کی اور صدر جلسہ ڈاکٹر فیروز احمد صاحب نے ٹرسٹ کے ترانہ کا افتتاح فرمایا جس سے مہمانان کرام اور حاضرین محترم نے بڑی مسرت و انبساط کا مظاہرہ کیا۔اس کے بعد اس سیشن کے

مہمانوں نے طلبا و ٹرسٹیز کو مبارک بادیاں دیں۔شری سبودھ کانت سہائے نے اتنے قلیل عرصے میں ٹرسٹ کی بے مثال ترقی اور کامیابی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ توقع کی کہ جلد ہی یہ ٹرسٹ جھارکھنڈ میں ایک ڈیمڈ یونیورسٹی قائم کرنے میں کامیاب رہے گا۔انہوں نے اقلیتی طبقہ کے غریب نوجوانوں کیلئے مختلف طرح کے انٹرویوز میں کامیابی حاصل کرانے کے لیے ٹرسٹیز کو ایک چھوٹا سا ادارہ قائم کرنے کا مخلصانہ مشورہ دیا اور اس سلسلے میں اپنے ایم، پی فنڈ سے دس لاکھ روپیے کی خطیر رقم دینے کا وعدہ فرمایا اور مبارک باد پیش کی کہ رانچی اور جھارکھنڈ بھر میں اس ٹرسٹ میں جو چار پانچ ہزار طلبا زیر تعلیم و تربیت ہیں یہ ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔جناب نورالاسلام صاحب فاؤنڈر سکریٹری الامین مشن، مغربی بنگال نے ارباب ٹرسٹ، حاضرین محترم اور طلبا کو خطاب کرتے ہوئے جھارکھنڈ میں بھی ''الامین'' مشن کے طرز پر کوچنگ سینٹرز کے نیٹ ورک قائم کرنے میں اپنے مشن کے ذریعہ ہر طرح کے نظری و عملی تعاون کی یقین دہانی کرائی اور ٹرسٹ کی اب تک کی خدمات کی توصیف و تحسین کرتے ہوئے ریاست جھارکھنڈ کے لیے اسے ایک نعمت قرار دیا۔

سجاد صاحب نے سارے عالم میں سائنس ٹکنالوجی کی برکات کے ساتھ تہذیب و اخلاق کا جو عظیم بحران پیدا ہوا ہے اس کی طرف مشاہیر ادب و تنقید کو متوجہ کیا کہ ادب و سائنس میں توازن قائم کیے بغیر انسانی تہذیب ہی نہیں انسانی نسل کا مستقبل بھی خطرے کی زد میں ہے اور ایک سخن گسترانہ بات یہ بھی کہی کہ جس اردو زبان و ادب نے جنوبی ایشیا بشمول برصغیر کو جس عظیم تہذیب و ثقافت اور مشترکہ کلچر سے مالا مال کیا اسی زبان و ادب کا دم بھرنے والے آج سب سے زیادہ اخلاقی قدروں کے بحران میں مبتلا ہیں لہذا اولین ضرورت خود احتسابی اور اصلاح احوال کی بھی ہے۔

سمینار کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر سرور ساجد معروف ادیب و شاعر نے مہمانان کرام اور حاضرین کا استقبال کیا اور یہ وضاحت کی کہ ٹرسٹ اپنی روایت کے مطابق پیش کردہ اور موصولہ تمام قیمتی

مقالات کا ایک مجموعہ شائع کرے گا لہذا مقالہ نگار حضرات سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے مقالات کی تلخیص پر اکتفا کریں اور اپنے مقالوں کے ساتھ اپنا سوانحی خاکہ اور پاسپورٹ سائز کی ایک تصویر حسب اطلاع یہاں پیش فرمائیں تا کہ جو مجموعہ شائع ہو اس کی حیثیت روایتی سے زیادہ دستاویزی ہو۔ چنانچہ مندرجہ ذیل مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے مقالے پیش فرمائے۔

نمبر شمار	نام مقالہ نگار	عنوان
۱	پروفیسر منصور عمر	اردو کا تخلیقی مزاج
۲	پروفیسر آفتاب احمد آفاقی	اردو تحقیق اور اخلاقی قدریں
۳	ڈاکٹر سید احمد قادری	اردو افسانوں میں اخلاقی قدریں
۴	ڈاکٹر مظفر مہدی	اردو پر اسلامی تحریکات کا اثر
۵	اسلم بدر	ادب اور اخلاقیات
۶	ڈاکٹر قمر جہاں	اردو ناول میں اخلاقی قدریں
۷	ظہیر غازی پوری	اردو رباعیات کا فن اور اخلاقیات
۸	پروفیسر ظفر حبیب	تعمیر پسند افسانہ نگاری اور ابن فرید
۹	ڈاکٹر محمود شیخ	جمہوریت کی اخلاقیات اور ادب
۱۰	غلام محمد چاپدانی	اردو ادب پر تحریکات اسلامی کا اثر
۱۱	ڈاکٹر کہکشاں پروین	خواتین افسانہ نگار اور اخلاقی اقدار
۱۲	ڈاکٹر خالد سجاد	اردو کا صوفیانہ ادب
۱۳	ڈاکٹر حسن مثنیٰ	مراثی انیسؔ میں انسان سازی کے عناصر

۱۳	ڈاکٹر جمال احمد	اخلاقی قدروں کے فروغ میں اردو ادب کا حصہ (نذیر احمد کے ناولوں کے حوالے سے)
۱۴	ڈاکٹر سرور ساجد	جھارکھنڈ کی اردو غزل، سب سے بڑی اخلاقی قدر لفظ 'خدا' کے حوالے سے
۱۵	روبینہ نسرین	سلمیٰ یاسمین نجمی ۔ اخلاقی قدروں کی ایک ممتاز فکشن نگار
۱۶	ڈاکٹر محمد جمال مصطفیٰ	اردو میں نعت گوئی ۔ اسباب مقبولیت
۱۷	ڈاکٹر امتیاز احمد	اردو غزل کے فروغ میں سیاسی تحریکات کا حصہ: اخلاقی اقدار کی روشنی میں (نئی اردو غزل اور سیاسی و سماجی و اخلاقی تناظر)

مہمانوں کی خدمت میں مومینٹو اور مقالہ نگاروں کی خدمت میں تشکر نامہ پیش کرنے کے بعد اجلاس اول میں ڈاکٹر رفعت سجاد صاحبہ چیر پرسن، مرکز ادب و سائنس ٹرسٹ، رانچی اور سمینار کے اختتام پر روبینہ نسرین ٹرسٹی و خازن ٹرسٹ کے اظہار تشکر پر اس شاندار تاریخی سمینار کے خاتمے کا اعلان کیا گیا۔

ارشاد احمد

بریا تو ہاؤسنگ کالونی، بریا تو رانچی، جھارکھنڈ

ادب اور اخلاقیات

جناب اسلم بدر

دو شاہکار تصویریں آپ کے سامنے ہیں۔ایک کا عنوان ہے 'مونالیزا' دوسری تصویر کا عنوان ہے 'دی ریپ' (انقلاب فرانس کے پس منظر میں)۔دونوں تصویریں مصوری کی دنیا کا شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔مونالیزا ایک خوبصورت عورت کی شبیہ ہے، جس میں مصور نے اپنا تمام ہنر اس عورت کے لبوں پر کھلتی ہوئی پر اسرار مسکراہٹ پر صرف کیا ہے۔'دی ریپ' میں بھی ایک عورت ہی ہے، مگر مادرزاد برہنہ ہے جس کے اردگرد کچھ فوجی اس کے ناموس کی دھجیاں اڑانے کے درپے ہیں۔مصور نے اپنی ساری ہنرمندی اس برہنہ عورت کے بدن کے قوس اور مختلف اعضا کے پیچ وخم پر صرف کردی ہے۔ایک عام ناظر جب پہلی تصویر دیکھے گا تو اس کی نظر سب سے پہلے اس عورت کے پروقار حسن پر پڑے گی، وہ عام ناظر اگر ناقد بھی ہے تو یہ بھی محسوس کرے گا کہ اس عورت کے ہونٹوں پر سجی ہوئی خفیف سی مسکراہٹ کس قدر پر اسرار ہے اور تب اسے ایک روحانی سرشاری محسوس ہوگی۔دوسری تصویر کو دیکھتے ہوئے عورت کا حسن تو کہیں دور جا پڑے گا، ایک برہنہ عورت کے بدن کے قوس پر اس کی نگاہیں جم جائیں گی۔وہ یہ بھی دیکھے گا کہ کس فوجی کا دست تصرف عورت کے بدن کے کس حصے پر کیسا ہے اور یہ بھی دیکھے گا کہ فوجیوں کے چنگل سے آزاد ہونے کے لیے اس برہنہ عورت کے بدن میں کیسی کھینچا تانی چل رہی ہے۔ایک عام ناظر کو یہ تصویر ایسے جنسی ہیجان میں مبتلا کردے گی کہ وہ پچکارے لے لے کر بار بار اس تصویر کو دیکھنا چاہے گا، ہوسکتا ہے اس کا بے حس دل یہ تمنا بھی کرے کہ کاش فوجیوں کے بیچ وہ بھی ہوتا۔اور اگر ناظر، ناقد بھی ہے اور اس کے دل میں سماجی شعور زندہ ہے تو اس مجبور عورت کے تئیں ہمدردی کا جذبہ بھی جاگ سکتا ہے۔ایک بات اور، کیا ایک مجبور عورت کی بے بسی کے اظہار کا یہی ایک ذریعہ ہے کہ اسے ننگا کر کے درندوں کے حوالے کردیا جائے؟ فیصلہ آپ کریں۔

عرض کرچکا ہوں کہ دونوں ہی تصاویر مصوری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔دیکھنا یہ ہے کہ مصور کیا دکھانا چاہتا ہے؟ کیسے دکھانا چاہتا ہے؟ جو کچھ وہ دکھانا چاہتا ہے، اس کا اثر دیکھنے والوں پر کیا پڑے گا؟ دونوں تصویروں کو

اپنے سامنے رکھ کر آپ سوچیں، آپ کے اندر سے ایک آواز ضرور آئے گی کہ کیا پہلی تصویر کو ہم اپنے اہل وعیال کے ساتھ دیکھ سکتے اور مصور کی ہنرمندی پر سیر حاصل گفتگو بھی کر سکتے ہیں۔ دوسری تصویر کے لیے ہماری سماجی تہذیب ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دے گی کہ ہم اسے اپنے اہل وعیال کے ساتھ دیکھیں، تصویر کے حسن وقبح پر گفتگو تو دور کی بات ہے۔

ادب کا معاملہ بھی مصوری کے معاملات سے کچھ زیادہ الگ نہیں ہے۔ مصوری میں مصور کے ہاتھوں میں موقلم ہے۔ ادب میں ادیب کے ہاتھوں میں قلم۔ مصوری میں لکیروں، رنگوں کی ہنرمند آمیزش ہوتی ہے، ادب میں الفاظ (زبان وبیان) کا ہنرمند استعمال۔ مگر جس طرح مذکورہ بالا دونوں شاہکار تصویروں میں ہم نے موقلم کی جنبش اور رنگوں کی ہنرمند آمیزش کے علاوہ بھی کچھ اور دیکھا ہے، یہی 'کچھ اور' ادب کا بھی لازمی جزو قرار پائے گا۔ یہی 'کچھ اور' ہے: اخلاقیات۔

کبھی آپ نے اس نکتے پر ضرور غور کیا ہوگا کہ ہم ادب کو 'ادب' ہی کیوں کہتے ہیں۔ غور کیجیے گا تو لفظ 'ادب' کا ماخذ دو بنیادی ستونوں پر کھڑا نظر آئے گا۔ ایک لفظ (یا زبان وبیان) اور دوسرا اخلاق (یا تہذیب)۔ اسی اخلاق کی بنیاد پر ہم ادب کو 'ادب' کہتے ہیں۔ صرف لفظوں کی مخصوص ترتیب وترکیب اور اس کے حسن کو ہی ہم ادب نہیں کہہ سکتے، اسے ادب کہنے کے لیے لفظوں کے حسین ترکیب وترتیب کے ساتھ ہماری تہذیب واخلاق کی بنفشی شعاعوں کا منعکس ہونا بھی لازمی ہوگا۔ یہاں لفظوں کے حسن پر بھی غور کیجیے۔ لفظوں کا یہی حسن ترتیب، ادب میں جمالیات کہلاتا ہے۔ اللہ خود حسین ہے اور حسن کو پسند کرتا ہے۔ اگر حسن ایسا ہے تو اسے سرتاسر خیر ہی خیر ہونا چاہیے۔ شر سے اس کا کیا تعلق؟ دنیا کے تمام فنون لطیفہ کا تعلق ایسے ہی حسن سے ہونا چاہیے۔ ادب میں بھی اسی حسن کی جلوہ گری مقصود ہوگی۔ اپنی منزل حیات تک پہنچنے کے لیے ہمارے سامنے دو راستے ہیں، خیر اور شر۔ ہمارے ادب میں بھی ہماری زندگی کے نقش ونگار ابھرتے ہیں تو ادب کے سامنے بھی یہی دو راستے ہوں گے۔ خیر اور شر۔ ادب میں، خصوصی طور پر شعری ادب میں بغیر جذبۂ عشق تخلیق ادب ممکن نہیں۔ ہمارے ادب میں اگر حسن کا پہلو خیر کا ہے تو عشق ہے اور اگر حسن مائل بہ شر ہے تو ہوس۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ ادب میں عشق کو راہ دینا چاہتے ہیں یا ہوس کو۔ دونوں ہی راہیں آپ کے سامنے کھلی ہوئی

ہیں۔عشق بھی شاہکار ہوسکتا اور ہوس بھی۔'مونالیزا' بھی شاہکار ہے اور 'دی ریپ' بھی۔

عرض کر چکا ہوں کہ ادب کے دو ماخذ ہیں، ایک ہے لفظ (یعنی زبان و بیان)، دوسرا اخلاق وتہذیب۔اب اخلاق وتہذیب کے بارے میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ اس کا ماخذ صرف اور صرف 'خیر' ہے، 'شر' نہیں۔اس کا پیمانہ سماج ہے فرد نہیں۔فرد کی فکر اگر سماجی فکر سے ہم آہنگ نہ ہو تو اسے بے ادبی، بے راہ روی، فحاشی، گندگی کے علاوہ کچھ اور نہیں کہا جاسکتا۔لہٰذا ادب کو ادب ہم اسی وقت کہیں گے جب الفاظ (اپنی جمالیات کے ساتھ) اخلاق وتہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ادب پاروں میں ان دونوں عناصر کا پایا جانا لازمی قرار پاتا ہے۔اگر کسی ادب پارے میں صرف اخلاقیات ہی اخلاقیات ہے،لفظوں کے استعمال میں تخلیقی جمال نہیں ہے تو اسے کچھ اور کہہ لیجئے، ادب نہیں کہا جاسکتا۔ٹھیک اس کے برعکس اگر لفظیات کے رکھ رکھاؤ میں انتہائی جمالیاتی عناصر کے باوجود بیان، اخلاق وتہذیب سے خارج ہے تو ایسے ادب کو بھی ادب سے خارج ہی سمجھنا چاہیے۔ایک ہی مثال کافی ہوگی۔مثنوی سحرالبیان کی پوری داستان ادب پارہ کہلاتی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ مثنوی میں زبان وبیان کی ایسی جمالیاتی فضا تیار کی گئی ہے کہ ایک ایک شعر پر منھ سے واہ نکل جائے۔مگر جب شاعر ایک دوشیزہ کے بدن (سینے) کا بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

گیا باغباں حسن کا رکھ کے بھول　　کنول کی کلی پر بنفشے کا پھول

تو اس شعر کو ادب کا نام نہیں دیا جاسکتا۔حالانکہ شعر میں سجے سجائے الفاظ بھی ہیں، خوبصورت تمثیل بھی ہے، شعر جمالیات کی بہترین مثال ہے۔مگر کنول کی کلی اور بنفشے کا پھول جیسی تمثیل کا چٹخارہ تو ہم لے لیتے ہیں مگر اس کی تشریح اپنی نوخیز بیٹی یا جوان طالبہ کے روبرو نہیں کرسکتے۔ ہمارا سماج، ہماری تہذیب اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم اپنی بیٹیوں کو بتائیں کہ کنول کی کلی اور بنفشے کا پھول کیا ہیں اور کیوں ہیں۔شعر کو زبان و بیان کے اعتبار سے خوبصورت تسلیم کرتے ہوئے بھی اخلاقی وتہذیبی فقدان کی وجہ کر ادب سے خارج کرنا ہوگا۔کیا ضروری تھا کہ ایسی معیاری مثنوی میں یہ اور اس جیسے دوسرے غیر اخلاقی اشعار شامل کیے جاتے۔اس کے برعکس ایک شعر اور دیکھیں:

رب کا شکر ادا کر بھائی　　جس نے ہماری گائے بنائی

اس میں نہ کوئی غیر اخلاقی بات ہے نہ بدتہذیبی، مگر اسے بھی ہم ادب نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اس شعر میں زبان کی جمالیات نام کی کوئی چیز نہیں ہے، محض لفظوں کی ایک سپاٹ بندش ہے۔ نثری ادب میں لفظی جمالیات کے فقدان کے باوجود کسی حد تک اس طرح کی سادہ بیانی کھپالی جاسکتی ہے کہ نثری ادب میں سادہ بیانی سے کام لینا اور خط مستقیم پر چلنا کام کی چیز ہوتی ہے وہیں شعری ادب میں تہہ داری اور خط منحنی کا سفر اہم ہے۔

اخلاق کا وہ تصور جو بالعموم اصلاحی ادب میں ملتا ہے، مثلاً فکشن میں ڈپٹی نذیر احمد جیسا اخلاقی رنگ بہت دیر پا نہیں ہوسکتا۔ مگر ایسے ہی اصلاحی ادب میں جب ہم شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف رجوع کرتے ہیں تو حسن یا جمالیات کی رنگ در رنگ دھنک سی بکھرتی دکھائی دیتی ہے۔

افسانوی ادب میں منٹو کو لے لیجئے، اس میں کسی کو کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی سادہ بیانی اور خط مستقیم کے سفر میں انتہائی کامیاب افسانہ نگار گزرا ہے۔ مگر ایک عجیب حیرت ناکی ہے کہ ہمارے ناقدین، منٹو کی عظمت کے بیان میں گھوم پھر کے وہی سات آٹھ افسانوں کے حوالے پیش کرتے ہیں جن میں جنسی تلذز کی بھرمار ہے۔ مثال کے طور پر ٹھنڈا گوشت، کھول دو وغیرہ۔ حالانکہ منٹو نے دو سو تیس سے زائد افسانے لکھے ہیں، جن میں کئی اعلیٰ افسانہ نگاری کی عمدہ مثال ہیں۔ منٹو کے متعلق ناقدین فن کی ایک عام رائے یہ بنتی ہے کہ 'گندگی میں اتر کے اس نے گندگی کو سمجھنے اور سمجھ کر من وعن پیش کرنے کی کوشش کی ہے'۔ جہاں تک سمجھنے کی بات ہے تو مجھے کہنے دیجئے کہ گندگی کو گندگی سمجھنے کے لئے سنڈاس میں کودنے ضرورت نہیں ہوتی۔ اور جہاں تک حقیقت کو من وعن پیش کرنے کا سوال ہے، تو میرے بھائی! یہ کام اخباری نامہ نگاروں کا ہے۔ جیسا دیکھا ویسا ہی بیان کردیا۔ شاعر و ادیب کو بھی ان حقیقتوں سے واسطہ پڑتا ہے، مگر وہ حقیقت کی عکاسی نہیں کرتے، نقاشی کرتے ہیں۔ کسی منظر کی عکاسی میں کمال تو عکاس کیمرے کا ہے، نقاشی میں مصور کا موقلم اور ادیب کا قلم اپنے جوہر دکھاتا ہے۔

ہم جسے جمالیاتی شاعری کہتے ہیں وہ استعارہ سازی کا ایک عمل ہے۔ جہاں الفاظ اپنے لغوی معنی سے اوپر اٹھ کر معنی آفرینی کی فضا قائم کرتے ہیں۔ جہاں الفاظ تھرتھراتے، پگھلتے ہیں، بکھرتے ہیں، سمٹتے ہیں، سنورتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی عمل کائناتی نظام میں بھی جاری وساری ہے، جہاں خالق اپنی تخلیق مکمل کرکے فارغ

نہیں بیٹھتا بلکہ ایک ایسا تخلیقی ماحول بھی تیار کرتا ہے کہ ہمہ دم، دم بدم ٹوٹنے بکھرنے بننے سنورنے کا عمل جاری وساری رہتا ہے۔ ع کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون۔

دوسرے لفظوں میں جمالیاتی شاعری دراصل خط منحنی پر چلنے والی تخلیقی شاعری کا دوسرا نام ہے۔ مگر خط منحنی کے اس سفر میں شاعر اکثر الجھ بھی جاتا ہے، ٹھوکریں بھی کھاتا ہے، منہ کے بل بھی گرتا ہے اور پھر ایسا ہوتا ہے کہ خاک کے بغیر اس کا اصلی چہرہ پہچان میں نہیں آتا۔ میر تقی میر جیسا شاعر جس نے انسانی تخلیق و شناخت کے تعلق سے ایسا لازوال شعر کہا:

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

وہ 'خدائے سخن' میر جب منہ کے بل گرتا ہے تو یہ کہنے سے بھی باز نہیں آتا کہ ''اس کی دوا تو عطار کے لونڈے کا پاس ہے''۔ عام قاری کے لیے معاملہ بڑی الجھنوں کا ہو جاتا ہے کہ اس 'خدائے سخن میر' کو اب کون سا نام دیا جائے؟

اپنے تمام شعری محاسن سے سجا سجایا غالب کا شعری دیوان جس کے بارے میں یہ کہا گیا کہ ہندوستان کو مغلوں نے دو عظیم شاہکار دیے، ایک 'تاج محل' دوسرا 'دیوان غالب'۔ اسی دیوان کا پہلا شعر:

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

اس بے بہا شعر میں غالب ایرانی شہنشاہوں کی درباری تہذیب کے حوالے سے کائنات کی بے ثباتی کی بات کرتا ہوا جہاں وہ واقعی 'اسد اللہ' نظر آتا ہے، وہیں ''کہا جو اس نے میرے پاؤں داب تو دے'' یا ''دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں'' ''ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن'' کہتا ہوا اسد اللہ خاں غالب منہ کے بل گر کے محض ایک عیاش مغل بچہ 'خاں' کے علاوہ اور کچھ نہیں رہ جاتا۔

شعری جمالیات سے بھرپور فراق گورکھپوری کے اس شعر کو لے لیجئے.....!

شام بھی تھی دھواں دھواں، حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

اس شعر میں فراق منظر نگاری، پیکر تراشی، استعارہ سازی، تخلیقی جمالیات کی بلندیوں پر کھڑا نظر آتا ہے۔ مگر اسی فراق کی ایک رباعی میں، وہی اداس حسن، دوران وصلت یوں پینگے لینے لگتا ہے کہ قاری کے ماتھے سے پسینہ اور منھ سے رال ٹپکنے لگتی ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو حقیقت نگاری ہے، دوران وصلت یہ سب کچھ تو ہوتا ہی ہے، بلکہ اس سے بھی بہت کچھ سوا ہوتا ہے۔ جی ہاں! آپ بالکل صحیح فرمارہے ہیں۔ فراق کو تو چھوڑیے، ایک عالم دین، ایک چترویدی پنڈت بھی اپنی ازدواجی زندگی میں ایسے پینگے لیتے ہوئے جسم سے گزرتا ہے، گزرتا رہتا ہے۔ مگر اوروں کی نگاہ سے چھپ کر، بند دروازوں کے اندر۔ بعض اوقات تو ایسی بے حجاب تنہائی میں بھی حجاب کا یہ عالم ہوتا ہے کہ بتیاں بجھالی جاتی ہیں، ایک دوسرے کو یوں بے حجاب دیکھنے میں بھی حیا آتی ہے۔ اب ذرا اس صاحب وصلت سے کہیے کہ اس حقیقت کو وہ سر بازار بھی بے حجاب کردے تاکہ اوروں کو بھی ایسے پینگے لیتے ہوئے بدن کے جمالیاتی منظر سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملے۔ پینگے مارتے ہوئے بدن کو تو چھوڑیے، سر بازار اپنے محبوب کے بدن کی بے حجابی بھی اسے منظور نہیں ہوگی۔ یہی ہماری تہذیب ہے، یہی ہمارے اخلاقی پہلو ہیں، زندگی کے بھی اور ادب کے بھی۔

اب تک میں نے شعری ادب کے میناروں کے غیر اخلاقی پہلوؤں کے حوالے پیش کیے ہیں۔ چلیے ایک پست قد، بلکہ لاوجود شاعر کا بھی حوالہ پیش کردوں۔ دوسروں کی طرف انگشت نمائی آسان ہے، دیکھنا یہ چاہیے کہ دوسروں کی طرف ایک ہی انگلی اٹھتی ہے، جب کہ انگلی اٹھانے والے کی طرف تین انگلیاں اشارے کرتی ہیں۔ تو چلیے خود اپنی شاعری کے ایک مخرب الاخلاق شعر کے چہرے سے بھی نقاب الٹتا چلوں۔ جمشید پور کی عمومی فضا ۱۹۶۴ء اور ۱۹۷۹ء کے فسادات کے بعد زہر آلود ہو چلی تھی۔ ادبی فضا پر بھی اس زہر کا اثر پڑنا تھا سو پڑا۔ فسادی غزلیں کہی جانے لگیں۔ میں نے بھی بے شمار فسادی اشعار کہے اور مشاعروں میں داد بٹورتا رہا، یہاں تک کہ ایسی داد لوٹنے والی شاعری کو ہی شاعری کا معیار بھی سمجھ بیٹھا۔ مگر ایک شعر نے مجھے وہ لعنت ملامت کی کہ آج تک سر اٹھانا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ حالات کے پیش نظر ۱۹۷۹ء میں بس یہ شعر ہو گیا تھا۔ غلطی سے یہ شعر ایک مشاعرے میں بھی سنا دیا گیا۔ میری ہی طرح ذہنی افلاس کے شکار سامعین نے داد کے ڈونگرے بھی

برسادیے۔ مجھے ایسا لگا کہ اس شعر میں کچھ ہے۔ ۱۹۸۸ء میں شائع شدہ شعری مجموعہ 'سفر اور سائے' میں وہ شعر شامل بھی کرلیا گیا۔ ایک سوچ ہی تو تھی، ایک انتقامانہ جذبہ ہی تو تھا۔ جس کے اظہار نے سر بازار مجھے ننگا کردیا تھا۔ سوچ کو زنجیر پہنانا مشکل ہے مگر اظہار پر تو قابو پایا جاسکتا ہے۔ بات ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ کتاب بازار میں آگئی، ناقدین نے سانچے میں ڈھلے ڈھلائے مضامین بھی لکھ مارے مگر کسی نے اس شعر کی طرف انگشت نمائی نہیں کی۔ مگر میرے بزرگ دوست سید احمد شمیم نے اپنے مضمون میں لکھا ''رجزیہ شاعری کی فضا کاڑھتے ہوئے کبھی کبھی اسلم بدر کا لہجہ ایسا انتقامی ہوجاتا ہے جو اعلیٰ انسانی قدروں سے میل نہیں کھاتا''۔ مگر فوراً ہی میرا دفاع کرتے ہوئے یہ بھی کہہ گزرے کہ: ''وقت کا بہاؤ اور حالات کی ستم ظریفی کبھی کبھی ہمیں انسانی اعلیٰ قدروں سے دور ہٹا دیتی ہے''۔ اب آپ بھی وہ شعر سن لیں۔ بلکہ اس غزل کے دو شعر سن لیں، پہلے شعر میں حالات کی منظر کشی ہے، دوسرا شعر وہ ہے جسے سناتے ہوئے میرا سر جھکا ہی رہے گا۔

میان باقی ہے شمشیر گر پڑی ہے تو کیا　　کہ اب بھی حوصلہ معرکہ سپاہ میں ہے
ہے دشمنوں کے قبیلے کی ایک لڑکی وہ　　کہ انتقام کا بھی ذائقہ گناہ میں ہے

میری پوری شعری کائنات میں یہی ایک شعر ایسا ہے جس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ میں نے ایسا سوچا ہی کیوں؟ سوچا تو لکھا کیوں؟ لکھا تو اسے بازار کے حوالے کیوں کردیا؟۔ آج بھی میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہتا ہے۔

ضمنی طور پر ایک بہت ہی اہم بات اور عرض کردوں۔ آج کے نوجوان شاعروں میں ''عطار کے لونڈے سے عشق''، ''محبوب سے دھول دھپا'' یا ''پینگے لیتا ہوا بدن'' جیسے اشعار کہنے کا رجحان نہیں پایا جاتا۔ میری سمجھ میں اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ناقدین نے شعری ادب میں ایسی جنس زدگی کو کبھی معیار تسلیم نہیں کیا۔ مگر آج کے افسانوی ادب کا مطالعہ کیجئے تو آپ بھی یہ محسوس کریں گے کہ آج کے اکثر نوجوان افسانہ نگار 'منٹو' بننے کے لیے فحاشی کے اعلیٰ مدارج طے کرنے کو فن سمجھے بیٹھے ہیں۔ منٹو کے 'کھول دو' جیسے افسانے پر ناقدین کی داد انہیں ایسا ہی لکھنے پر اکساتی رہتی ہے۔

ناقدین کو ہوشیار ہوجانا چاہیے کہ ان کے اس رویے سے افسانہ نگاری کی دنیا میں ایک عجیب سی مکروہ

فضا تیار ہورہی ہے۔ ہمارے نوجوان افسانہ نگاروں نے راتوں رات بڑا بننے کی فکر میں جنسی بے راہ روی، لذت پرستی، خودلذتی جیسی پستی کو معیار بنالیا ہے تاکہ انہیں بھی آج کا منٹو تسلیم کرلیا جائے۔ منٹو بننے کے لیے 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کی انتہائی پیچیدہ نفسیاتی واردات سے الجھنے کے بجائے انہیں شلوار کا ازار بند کھولنا آسان معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے کلاسیکی ادب میں بھی اعلیٰ کلاسیکیت کے ساتھ عریانیت وفحاشی کے اعلیٰ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ملاوجہی کے دو مثنویوں 'سب رس' اور 'قطب مشتری' کی مثالیں کافی ہوں گی۔ یاد رکھیے کہ ملاوجہی عالم دین بھی تھے۔ بادشاہ وقت نے اپنے شاہزادے کی اخلاقی تربیت کے لیے ملاوجہی سے 'سب رس' نام کی مثنوی فرمائش کرکے لکھوائی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مثنوی میں 'رموز حکومت'، 'اسرار زندگی'، 'مذہبی آگاہی' کے علاوہ اکثر حصے تعلیمی اور اخلاقی ہیں۔ مگر اسی مثنوی میں کچھ مناظر ایسے بھی ہیں جن پر دانشوران کی ترچھی نگاہیں اٹھنی چاہئیں، جن کے خلاف ناقدین کا بے باک قلم اٹھنا چاہیے۔ مگر وہ ایسے اشعار کو بھی جنسی جمالیات کے شربت میں گھول کر پی جاتے ہیں۔ ایسے مناظر سے شہزادے نے کیا اخلاقی درس لیا ہوگا، یہ تو ملاوجہی جانیں یا خود شہزادہ۔ ہوسکتا ہے شہزادے کی جنسی ناکارگی ایسے اشعار کی شان نزول رہی ہو۔ کونارک کے مندر میں بھی جنسی افعال میں غلطاں وپیچاں شاہکار مورتیوں کا بھی شاید یہی مقصد تھا۔ ملاوجہی کی 'قطب مشتری' کا بھی کچھ یہی حال ہے۔ دونوں مثنویاں کالج کے نصاب میں شامل ہیں۔ میں نے کالج کے اردو اساتذہ سے سنا ہے کہ وہ ایسے اشعار سے کترا کے گذر جاتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کیوں گزر جاتے ہیں؟۔ جواب ملتا ہے ہماری سماجی تہذیب اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے طلبا و طالبات کے سامنے ایسے اشعار پڑھ کر ان کے معنی سمجھائیں۔ شرم آتی ہے۔ یہی شرم تو ادب میں اخلاقیات کی حدیں مقرر کرتی ہے۔

مارکسی ادب کی طرح ان دنوں اسلامی ادب، اصلاحی ادب، تعمیری ادب کے خوب خوب چرچے ہیں۔ ان تمام رجحانات کو ادب کی اعلیٰ قدریں سمجھتے ہوئے بھی میں ادب کو ادب کی عینک لگا کر ہی دیکھنا پسند کروں گا۔ تخلیق ادب کو ادیان، نظریات، فلسفہ، سائنس کے خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھا جاسکتا۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ اگر فلسفیانہ افکار یا سائنسی حقیقتوں سے آپ آشنا ہیں تو فلسفہ اور سائنس کے عناصر آپ کی تخلیقات

میں ضرور در آئیں گے۔ میں اپنے کرم فرما و رہنما ڈاکٹر احمد سجاد اور ڈاکٹر حسن رضا کی مخلصانہ تحریک سے وابستگی کے باوجود معذرت کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ادب کو میں 'اسلامی ادب' کی قید با مشقت میں بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ دوبارہ عرض گذار ہوں کہ اگر آپ ادب کی ماہیت کو سمجھتے ہیں اور اسلامی فکر سے آشنا ہیں تو اسلامی قدریں خود بخود آپ کی تخلیقات میں در آئیں گی۔

اب ذرا ایک اور بات دل تھام کر سن لیجئے۔ اخلاقی ادب پر بہت بحث ہو چکی، مگر سچ تو یہ ہے کہ اخلاقی ادب کا محفوظ آنگن بھی ادب کی وسیع و عریض وادی میں کہیں گم ہو کر رہ جائے گا۔ بقول کسے: ''کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے''۔ بات اگر محض اخلاق کی ہوگی تو اخلاق کے پیمانے تراشتے ہوئے مشرقی اخلاق، مغربی اخلاق، سقراطی، کنفیوشسی اخلاقیات تک بات جا پہنچے گی۔ ادیان و مذاہب کے خانے بھی ادب کے لیے محبس ٹھہریں گے اور ہمارا بے چارہ و بے ضرر ادب، اسلامی ادب، ہندو ادب، جین ادب، بودھ ادب، عیسائی ادب، یہودی ادب، تاؤ ادب، ماؤ ادب اور نہ جانے کتنے خانوں میں بٹ جائے گا۔ ہماری فکر کی وسعتیں محدود ہو جائیں گی۔ اگر آج اسلامی ادب کا ایک الگ خانہ بنا بھی لیا جائے تو اسے سنی ادب اور شیعی ادب کے خانوں میں بٹنے سے کون روک سکے گا۔ پھر مختلف مسالک کی طرح، حنفی ادب، شافعی ادب، مالکی ادب، حنبلی ادب، غیر مقلد ادب، یہاں تک کہ حنفی ادب میں بھی بریلوی ادب، دیوبندی ادب کے خانے درخانے بنتے چلے جائیں گے۔ کتنے خانوں میں بانٹیے گا ادب کو؟

موضوع کے مرکز سے ذرا ہٹ کر، مگر موضوع کے محور کے اندر ہی رہ کر ایک آخری بات اور۔ ہمارے آج کے مرغ و ماہی پسند ملاؤں کی طرح ادب کو ہرگز ہرگز شرعی عینک لگا کر دیکھنے کو کوشش کبھی نہ کیجئے گا۔ ورنہ ہمارے شاعر اسلام علامہ اقبال بھی رد کر دیے جائیں گے۔

غافل تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں اپنا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک
در دشت جنوں من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ

یہاں تک کہ وہ اقبال بھی شرعی عدالت میں گناہگار ٹھہریں گے جن کی جبین نیاز میں تڑپتے ہوئے سجدے، حقیقت منتظر کو لباس مجاز میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

ادب کو بس ادب رہنے دیا جائے۔ بس ہمارا باشعور ذہن ہم سے بار بار ایک ہی سوال کرتا رہے۔ ادب کو ہم ادب ہی کیوں کہتے ہیں؟ اسی سوال کا جواب، ادب کا علاقہ ہوگا۔ جہاں ہماری تہذیب، ہمارا اخلاق، ہماری ثقافت، ہمارا سماج جیسے عناصر، ہمارے ادب کو زوال آمادہ ہونے سے بچاتے رہیں گے اور ہمارا ادب عروج کی منزلیں طے کرتا رہے گا۔ انشا اللہ۔

اردو پر اسلامی تحریکات کا اثر

ڈاکٹر مظفر مہدی، امریکہ

اسلامی تحریکات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حق و باطل کی کشمکش روزِ اول سے ہی رہی ہے۔ باطل قوتوں نے جب بھی، جہاں بھی اور جس شکل میں بھی انسانیت کو پامال کرنے کی کوششیں کیں تو حق پسندوں نے باطل افکار و نظریات اور ان کے مظالم کے خلاف منظم و متحرک ہو کر معاشرے کو ان سے نجات دلانے کی حتی المقدور سعی کی۔ یہ حق گو اور صاحبِ ایمان لوگوں کے لئے کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ خدا کی سرزمین میں باطل قوتوں کو سر اٹھانے اور ظلم کا بازار گرم کرنے کی اجازت دیں۔ اگرچہ اس اصلاحی اور جہادی عمل میں حق گوؤں کو بڑی بڑی قربانیاں بھی دینی پڑتی رہی ہیں تاہم صاحبِ ایمان لوگ حالات سے گھبرا کر خدا بیزار لوگوں کے سامنے سرنگوں نہیں ہوا کرتے بلکہ وہ بے خوف و خطر ان طاقتوں کا بڑی پامردی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں۔ جگر مرادآبادی کے لفظوں میں ایمان والوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ ؎

باطل کی ہو کتنی ہی طاقت   باطل کی اطاعت کیا معنی
ایماں پہ فدا ہو جاتے ہیں   جو صاحبِ ایماں ہوتے ہیں

امرِ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ یقین محکم رکھتے ہیں اور عمل پیہم کرتے ہیں وہ بادِ مخالف یا تاریک راتوں کی پرواہ نہیں کیا کرتے بلکہ ان کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ صبح کا اجالا ان ہی تاریک راتوں سے پھوٹتا اور دنیا کو روشن و تابناک کرتا ہے۔ جگر مرادآبادی نے صحیح کہا ہے کہ ؎

تعمیر نشیمن کے جذبے اٹھتے ہیں نشیمن کے جلنے سے
گلشن میں خزاں کے جھونکے ہی تمہید بہاراں ہوتے ہیں

یا پھر اقبالؔ کے لفظوں میں ۔ع

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

گویا ہر زمانہ اور دنیا کے ہر ملکوں میں حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی کا سلسلہ جاری رہا ہے اور یہ

سلسلہ آج بھی موجود ہے۔

دنیا کے مختلف ممالک کی طرح برصغیر ہندو پاک میں بھی اللہ کے نیک بندے ہر زمانہ میں باطل افکار ونظریات اور ظلم و بربریت کے خلاف متحد ومتحرک ہو کر پوری جگر کاوی کے ساتھ میدانِ کارزار میں اترے اور بندگانِ خدا کو نجات دلانے کی بھرپور کوشش کی۔

برصغیر ہندو پاک میں ابھرنے والی تحریکوں میں تحریک مجاہدین اپنی بے مثال تحریکی قوت، تنظیمی صلاحیت، عوامی مقبولیت، ایثار وقربانی، جذبۂ جہاد وعمل اور دوررس اثرات ونتائج کے اعتبار سے ایک بے حد اہم تحریک رہی ہے۔ یہ تحریک بہ یک وقت مذہبی بھی تھی، سیاسی بھی اور سماجی بھی۔ یہاں واضح رہے کہ اسلام میں مذہب وسیاست کی تفریق کا کوئی تصور نہیں اور اگر ان کو ایک دوسرے سے جدا کیا گیا تو اقبالؔ کے لفظوں میں ؎

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

تحریک مجاہدین کے بانی حضرت سید احمد شہیدؒ نے اپنے مشن کا آغاز ایک ایسے وقت میں کیا جب کہ ملت اسلامیہ ہند کے حالات انتہائی ناگفتہ بہ تھے۔ بے شمار سماجی خرابیوں کے ساتھ مذہبی اقدار بھی پارہ پارہ ہو رہی تھیں۔ شرک وبدعات کا شدید غلبہ ہو گیا تھا، ہزاروں ہندووانہ رسمیں مسلمانوں کی زندگی میں رچ بس گئی تھیں۔ ایک طرف مسلم معاشرے کی پراگندگی کا یہ حال تھا تو دوسری جانب مسلمانوں کو اپنے ہی ملک میں مظالم کا نشانہ بننا پڑ رہا تھا اور مذہبی اصولوں پر چلنا دوبھر ہو گیا تھا۔ گویا ملک کے حالات اتنے سنگین اور ابتر ہو گئے تھے کہ ایک تجزیہ کے مطابق:

''زمانہ اس کا منتظر تھا اگر سید احمد نہ ہوتے تو کوئی دوسرا سید احمد زمانہ پیدا کر دیتا'' [۱]

تحریک مجاہدین نہ صرف احیائے اسلام اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو واپس لانے نیز اصلاحِ معاشرہ کی سمت میں انقلابی اقدام کی حامل تھی بلکہ اس کے قیام کا مقصد ڈاکٹر قیام الدین کے خیال میں:

''یورپی کفار سے آزادی کی بازیابی بھی تھی'' [۲]

غرض یہ کہ یہ تحریک ہندوستان میں انگریزی اقتدار کو پایہ استقامت سے اکھاڑ پھینکنے اور مسلمانوں کو

انگریزی مظالم سے نجات دلانے کی سب سے پہلی منظم کوشش کہی جا سکتی ہے۔

تحریک مجاہدین کی عوامی مقبولیت اور اس کی سرگرمی کا دائرہ اس قدر وسیع اور اس کے اثرات اتنے ہمہ گیر تھے کہ بقول کے۔ایم۔اشرف:

> ''.....جس سے انگریزوں کے خلاف مسلم معاشرے کے مختلف طبقوں میں بھی اتحاد کا ایک وسیع محاذ پیدا ہو گیا۔اس محاذ میں سبھی شامل تھے۔جائیدادوں سے محروم امراء، تباہ دستکار، ناکام و نامراد علماء اور غیر مطمئن فوجی ہی نہیں اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے بھی ایک مشترک محاذ قائم کیا۔اور ڈاکٹر ہنٹر کے خیال میں ''ان کا نظام واقعی ایک بے قرار آبادی کے امید و بیم کے ساتھ ہم آہنگ تھا''۔ ۳

جو تحریک اتنی مقبولِ عام، اس قدر منظم، ہمہ گیر اور اعلیٰ نصب العین کے تحت سرگرم رہی ہو یہ کیوں کر ممکن تھا کہ وقت کے مدبر و مفکر، علماء و ادباء اور شعراء اس کے دائرہ اثر سے اپنا دامن بچا لے جاتے چنانچہ متعدد شواہد موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس تحریک نے اپنی مدتِ حیات میں اور اس کے بعد بھی چوٹی کے مفکر و مدبر اور ادباء و شعراء کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ ان کی فکر کو فکر بلیغ بنا دیا اور ان کی آبیاری میں زبردست رول ادا کیا۔اس ضمن میں فوری طور پر جو چند نام ذہن میں آتے ہیں وہ یہ ہیں مولانا عبدالحئی، مولانا مملوک علی، مفتی صدرالدین آزردہ، سرسید احمد خاں، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا جمال الدین افغانی، مولانا فضلِ حق خیر آبادی، مولانا رحمت اللہ، غالبؔ، مومنؔ، آتشؔ، ذوقؔ، مولانا حالیؔ، شاہ نصیر، جنرل بخت خاں، علامہ اقبالؔ، حافظ محمود خاں شیرانی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ۔

سرسید احمد خاں کی شخصیت اور ان کی فکر پر حضرت سید احمد شہید اور حضرت اسماعیل شہید کی انقلابی شخصیت اور ان کی تعلیمات کا گہرا اثر پڑا تھا بلکہ ان کی پرورش و پرداخت بھی خانوادۂ سید احمد شہیدؒ کے زیر اثر ہوئی تھی۔مولانا حالیؔ اعتراف کرتے ہیں کہ:

> ''سرسید کے یہاں جو آزادیٔ خیال اور جرأت گفتار ہے اس کا سرچشمہ بھی دراصل مولانا اسماعیل شہید کی تحریریں اور تقریریں ہیں''۔۴

جمال الدین افغانی کی عظیم شخصیت بھی تحریک مجاہدین کے اثر سے نہ بچ سکی تھی۔ مولوی احمد اللہ اور مولانا فضل حق خیر آبادی یوں تو باضابطہ تحریک مجاہدین سے وابستہ نہ تھے لیکن ان کے مشن میں کافی حد تک معاون و مددگار رہے۔ جنرل بخت ۱۸۵۷ء کی تاریخ میں بہت بلند مرتبہ رکھتا ہے ساتھ ہی وہ فکر کے لحاظ سے ایک کٹر وہابی تھا۔ مشہور محقق حافظ محمود خاں شیرانی کی نشو ونما بھی اسی تحریک کے آب وگل میں ہوئی تھی وہ ایک مجاہد خاندان کے ممتاز فرد تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت پر بھی کسی نہ کسی حد تک وہابی تحریک کا اثر رہا ہے۔

تحریک مجاہدین کے زیر اثر جب اردو ادب کی بات آتی ہے تو ہماری پہلی نظر اردو نثر پر جاتی ہے کہ اس تحریک نے اردو نثر کے فروغ میں کیا کچھ حصہ لیا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ وہابی تحریک کی نثری خدمات کے نتیجہ میں اردو نثر کو خاصا فروغ حاصل ہوا اور اسے ملک گیر عوامی زبان کا درجہ دلانے میں اس کا کافی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ بقول کلیم الدین احمد:

> "وہابی تحریک کا ایک اور کارنامہ ہوا جس پر کسی نے دھیان نہیں دیا اور وہ اردو نثر کو نثر بنانا۔ اسے ترقی دینا، اس کی ترویج کرنا وہابیوں کا ایک اہم کام تھا"۔

لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ جب جدید اردو نثر کا ارتقائی جائزہ لیا جاتا ہے تو اس ضمن میں فورٹ ولیم کالج، غالب اور سرسید کی نثری خدمات کا ذکر تو ہوتا ہے مگر تحریک مجاہدین کی نثری خدمات سے یکسر اغماز برتا جاتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کے زیر اثر لکھے گئے رسالوں اور تصانیف کے باعث اردو نثر کے اسلوب کے مزاج میں انقلاب انگیز تبدیلی آئی اور سادہ اور آسان نثر کا آغاز ہوا اور آگے چل کر اسے عوامی مقبولیت ملی۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر وہابی ادب نہ ہوتا تو دہلی کالج کی نثر اور سرسید احمد خاں کی تصانیف معرض وجود ہی میں نہ آتیں۔ وہ سادہ اور آسان نثر کو انگریزوں کی دین تسلیم کرنے کو تیار نہیں بلکہ ان کے خیال میں اس کی ابتدا بھی وہابی مصنفین کے ذریعہ ہی ہوئی تھی۔ اس معاملہ میں شیخ محمد اکرام، ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر اختر اورینوی بھی خواجہ احمد فاروقی کے ہم خیال و ہمنوا نظر آتے ہیں۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو اس ضمن میں دو طرح کی شخصیتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک وہ جو براہِ

راست اس تحریک کے مشن میں اپنے قائدین کے ساتھ ہم سفر و ہم رکاب رہے اور دوسرے وہ جنہوں نے دور رہ کر اس تحریک کا اثر قبول کیا اور اپنا فکری اور تخلیقی چراغ جلایا۔ اس طرح کے بزرگوں کی زندگی کا مقصد اور لائحہ عمل ہی شعر و ادب کی آبیاری کرنا رہا ہے۔ اس پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے فی الحال یہاں ان مجاہدین کا ذکر ہوتا ہے جنہوں نے شعر و ادب کو اپنی زندگی کا مقصد تو نہیں بنایا البتہ ان میں تخلیقی صلاحیت موجود تھی۔ لہذا انہوں نے نثر کے ساتھ ساتھ گاہے بگاہے تحریک کے مقاصد کو سامنے رکھ کر شاعری کی اور اپنے پیر و مرشد سے اپنی عقیدت اور ارادتمندی کا گہرا اظہار کیا۔ ان کے اشعار میں عقیدت کے پھول کھلتے دکھائی دیتے ہیں۔ تحریک کے بانی حضرت سید احمد شہیدؒ خود بھی شعری ذوق رکھتے تھے اور اپنے مریدوں کو شعر لکھنے اور کہنے کی جانب ترغیب دلاتے تھے۔

حضرت اسماعیل شہیدؒ جن کا نثر کے باب میں بڑا کارنامہ رہا ہے انہوں نے بھی بسا اوقات شاعری سے دلچسپی دکھائی۔ انہوں نے اپنے پیر و مرشد کی مدح میں ایک قصیدہ اور ایک مثنوی ''سلک نور'' کے نام سے یادگار چھوڑی ہیں۔ تحریک مجاہدین کے بزرگوں میں مولانا خرم علی بلہوری اور قاضی علاء الدین بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ یہ دونوں بزرگ تصنیف و تالیف سے جڑے ہوئے تھے اور تحریک کے مقاصد کے تحت وقتاً فوقتاً شاعری کیا کرتے تھے۔ مولانا خرم علی کی ایک نظم جہاد کی فضیلت میں ہے جس کا ایک شعر بطور نمونہ پیش خدمت ہے ؎

فرض ہے تم پہ مسلمانو جہاد کفار　　اس کا ساماں کرو جلد اگر ہو دیندار

اسی طرح دوسری نظمیں ہیں جو اصلاحی مقاصد کے تحت پیش ہوئی ہیں۔

قاضی علاء الدین بڑے پایہ کے عالم تھے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں اسلامی مسائل کو ڈھال کر پیش کرنا شروع کیا ہی تھا کہ شہید کر دئے گئے اور اس طرح ان کا شعری سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔

گروہ مجاہدین میں ان دو ممتاز بزرگوں کے علاوہ کچھ اور نام بھی نا قابلِ فراموش ہیں ان کے نام اس طرح ہیں: مولوی نصیر الدین، مولانا ابوالحسن، مولانا عبدالحق آروی، مولانا یحییٰ علی، میر قاسم علی، امین اللہ پیام، مولوی محمد حسین فقیر، حیدر حسن، مولانا فتح اللہ، مولوی عبدالرحیم، شاہ نور محمد، عبدالمجید صادق پوری وغیرہ وغیرہ۔

مولوی نصیر الدین کی شخصیت مجاہدین کے گروہ میں بہت ہی نمایاں تھی۔آپ کا ممتاز کارنامہ یہ ہے کہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے دوسرے جانباز رفقاء کی شہادت کے بعد آپ ہی نے تحریک کی زمام کار سنبھالی اور تحریک کو زندہ رکھا۔آپ شعر بھی کہا کرتے تھے ان کے اشعار میں تحریکی جھلک پوری طرح نمایاں ہے۔مولانا ولایت علی مشہور عالم اور تحریکی مجاہد تھے آپ کو بھی شعروشاعری سے گہرا لگاؤ تھا۔

تحریک کے متوسطین میں حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ اور مولانا قاسم نانوتویؒ دونوں ہی شعر کہا کرتے تھے۔مولانا یعقوب کا شعری مجموعہ ''بیاض یعقوبی'' اور مولانا قاسم نانوتوی کے قصائد کا مجموعہ ''قصائد قاسمیہ'' کے نام سے مشہور ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے ایک مشہور مصنف بینی نرائن جہاں ؔ جو شاعری بھی کرتے تھے ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا اور سید احمد شہیدؒ سے بیعت بھی ہو گئے تھے۔ان کے علاوہ کئی اور نام پیش کئے جاسکتے ہیں جو اس تحریک سے وابستہ تھے اور اشعار کہا کرتے تھے۔لیکن جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا گیا کہ ان تمام بزرگوں کی ترجیحات شعروشاعری نہیں رہی ہیں البتہ ان میں تخلیقی صلاحیت موجود تھی جس کے باعث گاہے بگاہے تحریکی مقاصد کے پیش نظر شعری اظہار بھی کرلیا کرتے تھے۔

بزرگوں کے اس ذکر سے نکل کر جب ہم اس دور کے معروف غزل گو شعراء کی طرف آتے ہیں اور جدید تحقیق کی روشنی میں ان کا مطالعہ کرتے ہیں تو جو حقائق ہمارے سامنے آتے ہیں وہ اس مطالعہ کو اور زیادہ دلچسپ اور معلومات افزا بنادیتے ہیں۔جیسا کہ اردو شعروادب کا قاری اس بات سے واقف ہے کہ حکیم مومن خاں مومن تحریک مجاہدین سے متاثر تھے۔وہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے مرید بھی تھے۔وہ تا حیات اس تحریک سے جذباتی طور پر وابستہ رہے چنانچہ ان کے مختلف اشعار، قطعات اور نظموں کے مطالعہ سے ان کی گہری وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ان کا ایک شعر بطور نمونہ ملاحظہ ہو ؎

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب　　یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

پروفیسر خواجہ منظور حسین نے مومن کے بعض ایسے اشعار کی بھی نشاندہی کی ہے جن میں تمثیل کے پردے میں اس تحریک سے ان کی دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔پروفیسر خواجہ منظور حسین کے مطالعہ وتحقیق کے مطابق

نہ صرف مومن کے یہاں تحریک سید احمد شہیدؒ کے اثرات نمایاں ہیں بلکہ ذوق، شاہ نصیر، آتش، ناسخ، شیفتہ اور سب سے بڑھ کر غالب سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔

خواجہ منظور حسین کی معرکۃ الآرا کتاب ''تحریک جدوجہد۔ بہ موضوع سخن'' پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر شان الحق حقی کہتے ہیں کہ:

> ''خلاصہ'' جناب مصنف کا کہنا ہے کہ اساتذہ اردو کے دواوین میں بہت سے مطالب جو زلف، مژگاں، عارض ولب اور خال وخط وغیرہ کی اصطلاحوں میں بیان کرتے ہیں۔ ان کی تعبیر اور بھی ہے اور وہ بات دور تک پہنچتی ہے۔ ان اشعار کے معانی کو ان کلیدوں کے ذریعہ کھولا جائے جو مصنف نے بتائی ہیں تو معلوم ہوگا کہ گذشتہ صدی کے نصف اول میں ہمارے غزل گو اساتذہ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریک جہاد سے کس حد تک متاثر تھے اور یہ موضوع ان کے ذہن وتخیل پر کس درجہ مستوی رہا ہے''۔ [۱]

پروفیسر خواجہ حسین کی تحقیق کی رو سے غالب کے فارسی اور اردو کے متعدد اشعار میں تحریک مجاہدین کی جھلکیاں کافی حد تک موجود ہیں۔ غالب اپنی آزادانہ طبیعت کے باوجود قائدین تحریک سے ایک گونہ عقیدت رکھتے تھے۔ پروفیسر منظور حسین کا بیان ہے کہ:

> ''تخلیقی عمر شروع ہوتے ہی غالب کی اثر پذیر طبیعت کا سابقہ شاہ اسماعیل اور مولوی فضلِ حق جیسے دو سراسر مختلف مزاج متناقض مسلک کے جید (اور جابر) معلموں سے واسطہ پڑا اور دونوں نے انہیں اپنے رنگ میں رنگنے اور اپنے مخصوص عقائد کا ترجمان اور نقیب بنانے کی خاطر ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا۔ شاہ اسماعیل شہید نے اپنی مقناطیسی شخصیت اور مجاہدانہ حرارت کے زور سے نوجوان مرزا کو کچھ دیر کے لئے زبردستی سید احمد شہید کے حلقۂ ارادت میں داخل کرایا.....''

ذیل میں غالب کی ایک مشہور غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جس کے بارے میں پروفیسر موصوف کا خیال ہے کہ ''یہ پوری غزل تحریک جدوجہد سے متعلق بعض مضامین پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اس

کے مختلف شعروں میں تحریک کی مختلف خصوصیات کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے جاں کالبدِ صورت دیوار میں آئے

تب نازگراں مائیگی اشک بجا ہے جب لختِ جگر دیدۂ خوں بار میں آوے

یہ اشعار منظور صاحب کے خیال میں سید صاحب اور شاہ صاحب کی جاں فزا تقریر کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔اس طرح یہ شعر ؎

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو صنوبر تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

یہاں خواجہ صاحب نے تو سے مراد سید صاحب سے لیا ہے اور سرو صنوبر شاہ صاحب اور مولانا عبد الحئی کو بتایا ہے۔ خواجہ صاحب کی زیر مطالعہ کتاب کا نصف حصہ تحریک مجاہدین کے اثرات سے بحث کرتا ہے۔ اسی طرح آتش ،شیفتہ ،ذوق اور علامہ اقبال کے اشعار بھی پیش کر کے ان میں اس تحریک کے غالب اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ علامہ اقبال کے سلسلے میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کہتے ہیں کہ ''سید احمد شہید اور اسماعیل شہید سے غالباً ویسی ہی گہری عقیدت اور وابستگی تھی جیسی کہ ٹیپو سلطان سے تھی [۱۵]

مختصر یہ کہ تحریک مجاہدین کا مذکورہ مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ زیر مطالعہ تحریک نے مذہب، سیاست اور سماج ہی کو متاثر نہیں کیا بلکہ اردو زبان و ادب پر بھی اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

برصغیر کے منظر نامہ پر تحریک مجاہدین کی طرح ہی تحریک خلافت بھی ایک اہم تحریک نظر آتی ہے۔ اگر چہ اس کی مدت کارکردگی اور اس کا دائرہ کار اتنا وسیع نہیں رہا ہے جتنا کہ تحریک مجاہدین کا مگر اس کے باوجود اس نے کم مدت میں ہی جو جوش واثر پذیری دکھائی وہ نا قابل فراموش ہے، یہ اتحاد ملی اور اتحاد قومی کا ایک ایسا شاندار نقشہ پیش کرتی ہے کہ اس سے قبل اس کی کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی ہے۔ مزید یہ کہ اس نے حکومت برطانیہ کی بنیادوں کو جس طرح متزلزل کیا وہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ یہ مسئلہ خلافت کو لے کر اٹھی اور جیسا کہ ہم بھی جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ مسلمانوں کے دین وایمان اور ان کی عزت ووقار سے جڑا ہوا تھا۔ برطانوی حکومت کے ساتھ مسلمانوں کی تمام تر وفاداریوں کو انگریزی سرکار نے درکنار کرتے ہوئے سلطنت عثمانیہ کو ختم کر کے ترکی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ چنانچہ اس کھلی دشمنی پر مسلمانانِ ہند کا دل رو پڑا اور ان کے جذبات مشتعل ہو گئے لہذا

اس واقعہ نے برصغیر کے مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کی ایک لڑی میں پرو دیا اور نہ صرف مسلمان بلکہ برادرانِ وطن بھی مسلمانوں کے ہم نوا اور ہم آواز بن گئے۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسی تحریک جس کا ملک گیر اثر ہوا ہو اس سے ہمارے دانشور اور ادیب و فنکار ساحل پر کھڑے محض تماشائی بن کر نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ اس دور کے شعراء و ادباء نے اپنے اپنے طور پر نثر اور شاعری دونوں میں اپنے خیالات کا پُرزور اظہار کیا۔ علامہ شبلی جو اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم اور ادیب و شاعر تھے انہوں نے ترکی کی سیاسی صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے ایک شعر میں یوں کہا ؎

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے　　کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جان کب تک

علامہ شبلی دولت عثمانیہ کے زوال کو ملت اسلامیہ کا کتنا عظیم نقصان تصور کرتے ہیں اس کا اندازہ ان کی مشہور نظم ''شہر آشوب اسلام'' سے لگایا جا سکتا ہے۔

آرزو لکھنوی اگرچہ بنیادی طور پر رومانیت پرست شاعر تھے مگر اس کے باوجود وہ اس اہم مسئلہ پر خاموش نہ رہ سکے۔ وہ دولت عثمانیہ کے زوال کو پوری ملت کا زوال تصور کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے درد و غم کا اظہار اپنے اشعار میں یوں کیا ہے ؎

ملتان ہو کہ ایران، ترپولی یا مراکو　　اک وقت میں لٹا ہے ہر کارواں ہمارا
کیا کام اس شجر سے سرسبز ہو کہ سوکھا　　جس پر نہیں ہے باقی اب آشیاں ہمارا

مولانا محمد علی جوہر نے اپنے مشہور زمانہ اخبار ''کامریڈ'' میں ایک مضمون ''ترکوں کا انتخاب'' لکھ کر مملکت برطانیہ کو مشورہ دیا کہ وہ ترکوں کی دلجوئی کر کے ان کے ساتھ مصالحت کرے۔ اس مضمون کا اثر یہ ہوا کہ حکومت نے ان کو گرفتار کر لیا بعد میں یہی واقعہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا شوکت علی کے ساتھ بھی پیش آیا۔ حکومت کے اس رویہ کو اہلِ ملک نے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ حکومت برطانیہ کے اس ظالمانہ رویہ سے متاثر ہو کر اکبر الہ آبادی نے بھی ایک پُرمعنی غزل لکھ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا ؎

زباں ہے ناتوانی سے اگر بند　　مرے دل پر نہیں ہے معنی کے در بند
بیادِ رنج یاراں نظر بند　　کیا ہم نے بھی اب ملنے کا در بند

ہماری بے کسی کب تک چھپے گی　　خدا پر تو نہیں راہ خبر بند

علامہ اقبالؔ کا قلب بھی اس واقعہ اسیری سے زخمی ہوتا ہے چنانچہ انہوں نے ''اسیری'' کے نام سے ایک نظم لکھ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

تحریک خلافت کی ابتدا میں خلافت عثمانیہ کے تحفظ و بقا کے لئے جب مولانا محمد علی جوہر ایک وفد لے کر انگلستان گئے تو علامہ اقبالؔ نے مولانا محمد علی جوہر کے اس اقدام کی مخالفت کی اور دریوزۂ خلافت کے نام سے ایک نظم لکھی اور کہا کہ ؎

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے　　تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا　　خلافت کی کرنے لگا تو گدائی

دراصل علامہ اقبالؔ اس خلافت کے خواہاں تھے جو ماضی کا حصہ تھی چنانچہ وہ بڑے جذباتی انداز میں پوری مسلم ملت کو للکارتے ہوئے کہتے ہیں ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے　　نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر
تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار　　لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی تحریک خلافت کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ مولانا محمد علی خلافت کو اپنے دین و ایمان کا جزو تصور کرتے تھے۔ ہر لمحہ ان کی توجہ ترکوں پر لگی رہتی تھی اور خلافت کی بقاء کے لئے وہ سب کچھ کر گذرنے کو تیار رہا کرتے تھے۔ ان کا حال مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے لفظوں میں یہ تھا کہ ''جسم قید فرنگ میں ہے، دل ترکوں میں اٹکا ہوا ایک دن دور دراز سے اللہ اکبر کے نعرے کان میں آتے ہیں دل معاً گواہی دے اٹھتا ہے کہ ہو نہ ہو ترکوں نے سمرنا فتح کر لیا ہے۔ جوش سے بیخود قیدیٔ گوشہ نشیں کہہ اٹھتا ہے ؎

عالم میں آج دھوم ہے فتحِ مبین کی　　سن لی خدا نے قیدیٔ گوشہ نشین کی

مولانا ظفر علی خاں بھی اس تحریک کے لئے کافی سرگرم رہے۔ ان کی نثری تحریروں کے علاوہ ان کی شاعری میں بھی تحریک خلافت کے اثرات کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنے اخبار ''زمیندار'' میں

اس مسئلہ پر مسلسل ومتواتر مضامین لکھے ساتھ ہی متعدد نظمیں بھی کہیں۔

مولانا حسرت موہانی کے یہاں بھی اس تحریک کے اثرات نمایاں ہیں، وہ خود بھی اس تحریک میں سرگرم وفعال رہے اور اپنے جذبات واحساسات کو شاعری کے پیرایہ میں ڈھال کر پیش کیا۔

تحریک خلافت کے عروج میں بعض ایسی نظمیں بھی منظر عام پر آکر زبان وزد عام ہوئیں کہ جن کے شعراء گمنام تھے۔ان نظموں کی کوئی فنی حیثیت تو نہیں البتہ تاریخی حیثیت ضرور ہے۔

برصغیر کے منظر نامہ پر ایک تیسری اسلامی تحریک ''تحریک اسلامی'' یا جماعت اسلامی نظر آتی ہے جو عرصہ سے اسلام کی ہمہ گیر دعوت کے تحت سرگرم عمل ہے اور اب اس کی صدائے بازگشت ہندو پاک کے خطہ ارض سے نکل کر دنیا کے مختلف ممالک تک جا پہنچی ہے۔اس تحریک کے بانی اور قائد سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ابتدا سے ہی اسلام کے مکمل پیغام کو اپنے پیشِ نظر رکھا اور عصری تقاضوں کو سامنے رکھ کر جدید انداز اور سائنٹفک اسلوب میں اسلام کی تشریح وتوضیح کی اور اسلامی لٹریچر کا ایک بڑا سرمایہ پیش کر دیا جو نہ صرف اسلامی ذخیرہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہے بلکہ یہ دینی ادب کا ایک دلکش ودل آویز نمونہ بھی ہے۔

تحریک اسلامی نے روز اول سے ہی جہاں عصری تقاضوں پر توجہ دی وہیں اس کی نظر شعروادب پر بھی رہی ہے چنانچہ اس نے اسلام پسند شعراء وادباء کو متحد ومنظم کر کے ایک ادبی تحریک ''تعمیر پسند ادبی تحریک'' کا آغاز کیا۔اس ادبی تحریک کے فکری ڈانڈے یوں تو قدیم ادب سے ملتے دکھائی پڑتے ہیں۔لیکن اصلاً اس کا تعلق فکر اقبال سے زیادہ قریب ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ تعمیری ادبی تحریک دراصل ادب میں نظریہ اقبال کی توسیع ہے۔

بہر کیف!اس تحریک سے متاثر ادیب وفنکار کی ایک معقول تعداد فکر اسلامی کے تحت اردو شعروادب کی خدمت کرتی ہے جن میں چند نام بے حد اہم ہیں اور یہ وہ نام ہیں جن کو دوسرے بھی احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ان میں سب سے پہلی نظر مشہور ومتاز فنکار وادیب ماہر القادری پر جاتی ہے جو ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔انہوں نے تاعمر شعروادب کا چراغ جلائے رکھا اور کئی شعری مجموعے مثلاً ''فردوس، محسوسات ماہر، نغماتِ ماہر اور جذبات ماہر'' یادگار چھوڑے ہیں۔

ماہر القادری نہ صرف ایک کامیاب شاعر تھے بلکہ وہ ایک صاحبِ طرز نثر نگار بھی تھے۔ان کے افسانے، ناول، خاکے، تبصرے اور فاران کے اداریوں کی ژرف نگاہی اور تنقیدی بصیرت کو اردو دنیا فراموش نہیں کرسکتی ہے۔

نعیم صدیقی اردو کے مشہور شاعر، افسانہ نگار اور صاحبِ طرز نثر نگار رہے ہیں۔ان کو تعمیر پسند ادبی تحریک کا سرخیل کہا جاسکتا ہے۔انہوں نے شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔مرحوم ادب میں اسلامی تحریکیت کے حامل ہونے کے باوجود شاعری کو ایک جمالیاتی عمل قرار دیتے ہیں اور اپنی شعری تخلیقات میں اس پہلو کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔

اسلامی ادیب کے طور پر مائل خیر آبادی کافی مشہور رہے ہیں۔ان کا رسالہ ماہنامہ ''حجاب'' طبقہ نسواں میں کافی مقبول رہا ہے۔ان کے ناول اور افسانے بالخصوص بچوں کے ادب کے سلسلے میں ان کی خدمات گراں قدر رہی ہیں

اسلام پسند حلقوں میں ہی نہیں دوسرے طبقوں میں بھی حفیظ میرٹھی اپنی اعلیٰ شاعری کے لئے جانے جاتے رہے ہیں۔بالخصوص ایک کامیاب غزل گو کی حیثیت سے اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔

مذکورہ ناموں کے علاوہ شاعری کے میدان میں شورش کاشمیری، ابوالمجاہد زاہد، سہیل احمد زیدی، عزیز بگھروی، عامر عثمانی، عروج زیدی، عروج احمد قادری، امام الدین رام نگری، عاصی کرمانی، مولانا حاذق ضیائی سہسرامی انتظار نعیم، تابش مہدی اور منصور عمر وغیرہ شاعری کے میدان کے وہ چاند ستارے ہیں جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

تعمیری فکشن کی دنیا میں نعیم صدیقی، ماہر القادری، مائل خیر آبادی کے علاوہ ابنِ فرید، م۔نسیم، جیلانی بی۔اے، بازغہ تبسم، ظفر حبیب اور دوسرے کئی اور نام قابلِ ذکر ہیں۔ان کی صاف ستھری اور اعلیٰ اقدار سے مزین کہانیوں نے یقینی طور پر اپنے قاریوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ اردو کے معروف وممتاز فکشن نگاروں نے جو اردو دنیا کے سامنے ایک معیار قائم کیا ہے ہمارے افسانہ نگار ان معیاروں تک نہیں

پہنچ سکے ہیں بالخصوص اردو ناول میں ماہر القادری کا سیرتی ناول ''دُرِّ یتیم'' اور ''ہوتی ہے سحر پیدا'' (بدنام رفیقی) کے علاوہ کوئی اور قابلِ ذکر ناول اردو دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکا ہے۔

شاعری اور فکشن کی دنیا سے نکل کر اگر اردو تنقید پر نگاہ ڈالی جائے تو یہاں ہماری نظر پروفیسر عبدالمغنی ماہر اقبالیات، ڈاکٹر ابنِ فرید، پروفیسر احمد سجاد، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، پروفیسر سید عبدالباری، عامر عثمانی، ابوذر عثمانی، اسعد گیلانی، خواجہ ذکریا، سراج منیر، شمیم احمد، پروفیسر فروغ احمد، ڈاکٹر تحسین فراقی جیسے ممتاز ناقدین پر پڑتی ہے جو اردو تنقید کی معتبر و مستند آوازیں ہیں۔ ان کی تنقیدی آرا کو نظریاتی اختلاف کے باوجود قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ ان ناقدین کے علاوہ پروفیسر ظفر حبیب، مولانا طیب عثمانی، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی، ڈاکٹر منصور عمر اور کئی دوسروں نے اردو تنقید کی دنیا میں اپنی موجودگی کا توانا احساس دلایا ہے۔

سطور بالا میں تین اسلامی تحریکوں کا اردو شعر و ادب کے تعلق سے مطالعہ پیش کیا گیا اور دیکھا گیا کہ اپنے اپنے وقت کی ان تین عظیم تحریکوں نے اردو شعر و ادب کو کس حد تک متاثر کیا۔ اس مطالعہ کے ذریعہ یہ سچائی سامنے آئی کہ ان تحریکوں کے زیر اثر جو بھی شعر و ادب سامنے آیا وہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک گراں قدر حصہ ہے ساتھ ہی ہماری ناچیز رائے یہ بھی ہے کہ اگر ہم اپنے مطالعہ کو اور زیادہ وسعت دیں اور تلاش و تحقیق سے کام لیں تو یقینی طور پر دوسری اسلامی تحریکوں مثلاً تحریک دیوبند، خاکسار تحریک، تحریک بریلویت، جمعیۃ العلماء، تبلیغی جماعت اور تحریک اہلِ حدیث (سلفی تحریک) کے تعلق سے بھی اردو شعر و ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہمارے ہاتھ لگ سکتا ہے۔

تعمیر پسند افسانہ نگاری اور ابنِ فرید

پروفیسر ظفر حبیب

سابق صدر شعبہ اردو، متھلا یونیورسٹی دربھنگہ

زبانِ اردو اپنی تخلیق، تاسیس اور تشکیل کے روزِ اول سے ہی اخلاقی قدروں کی حامل رہی ہے۔گرچہ اس کی پیدائش ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی مشترک زبان کی شکل میں ہوئی۔لیکن اس کے سرِ آغاز پر جن لوگوں کے نام اب تک کی تحقیق کے مطابق منظرِ عام پر آچکے ہیں وہ سب کے سب صوفیا، علماء اور بزرگانِ دین تھے۔مولوی عبدالحق صاحب نے اس حقیقت کو ثبوت کی سند عطا کی ہے اور بعد کے محققین نے بہ اطمینان اس کی تائید کی ہے۔ملا وجہی کی ''قطب مشتری'' اور بندہ نواز گیسودراز کی ''معراج العاشقین'' تصوف اور اردو شاعری کے اولین مجموعے قرار دئے گئے ہیں اور یہ دونوں کے دونوں لسانی فطرت اور اہمیت کے باوصف اخلاقی قدروں کے فروغ کی کامیاب کوششیں ہیں۔امیر خسرو کی شاعری بظاہر عاشقانہ ہے لیکن اس کا نشانہ بھی اپنے پیر و مرشد سے محبت کا اظہار اور اقرار ہے۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نینا بنائے بتیاں

کہ تابِ ہجراں نہ دارم اے جاں، نہ لے ہو کاہے لگائے چھتیاں

یہاں سے جو بات شروع ہوئی ہے اب وہ بات یہاں تک پہنچی ہے کہ اس عہدِ بے حیائی، عریانی، اباحیت، بدچلنی، بے راہ روی، سفلا پن کے جذبات سے مغلوب سماج کے سامنے بھی اردو اپنی اخلاقی قدروں کے دامن کو چھوڑنے کو کسی بھی حال میں تیار نہیں ہے۔آج کا سمینار اسی حقیقت پر دال ہے۔

اردو کی اصنافِ ادب میں آج ہم فکشن پر اپنی نظر مرکوز کرتے ہوئے جب تاریخ کے اولین اوراق پلٹتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد ''ابن الوقت، توبۃ النصوح اور بنات النعش'' جیسی تحریریں ہاتھ میں لئے کھڑے ہیں۔ان سے آگے بڑھ کر مولانا عبدالحلیم شرر ہیں، راشد الخیری ہیں اور آگے بڑھتے ہوئے نسیم حجازی ہیں، صادق صدیقی سردھونوی ہیں۔مرزا ہادی رسوا ''امراؤ جانِ ادا'' لکھتے ہیں تو ایک ''شریف زادہ'' کو اس کے پیچھے لگا دیتے ہیں۔ان سے آگے بڑھئے تو مائل خیر آبادی ہیں جو بچوں،

جوانوں اور بوڑھوں سب کے لئے اخلاقی کہانیاں اور ناول لکھتے نظر آتے ہیں۔ماہر القادری ''درِ یتیم'' کا تحفہ اخلاق مندی سے محبت کرنے والوں کو پیش کرتے ہیں۔

ناول کی دنیا سے نکل کر جب ہم افسانے کے میدان میں آتے ہیں تو یہاں بھی ایسے قلم کاروں سے ہماری ملاقات ہوتی ہے کہ جن کی فکر ونظر شریفانہ اور اخلاق مندانہ ہے۔پرانے دنوں میں جو شعراء اور ادباء ہوتے تھے ان کے سامنے کسی تحریک کا تصور نہیں تھا وہ اپنے ذوق ووجدان کی تسکین کے لئے کچھ لکھتے پڑھتے تھے اور ان کا مشن یہ ہوا کرتا تھا کہ سماج کو ہمیشہ شرافت کی راہ پر چلتے رہنے کی تاکید اور فہمائش کی جاتی رہے۔لیکن بیسویں صدی میں جب دنیا میں تنظیموں کی تشکیل کا تصور رائج ہوا تو ہر تنظیم کے قیام کی پشت پر کوئی نہ کوئی واضح نظریہ کی موجودگی نے ان نظریہ سازوں کو اس کے لئے آمادہ کیا کہ اپنے نظریات کو منظم طور پر دوسروں تک منتقل کریں۔ایک سماجی شعور بیدار کر کے اس نظریہ کو استحکام اور بقا بخشنے کی مہم نے تحریکیت کو جنم دیا اور اب کوئی تنظیم ایسی نہیں رہی جو تحریک سے خالی ہو۔جمہوریت کا تصور جیسے جیسے دنیا میں پھیلتا جا رہا ہے تحریکیت بھی اسی طرح بالیدہ اور پختہ ہوتی جا رہی ہے۔امریکہ کے متعلق یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہاں کتوں کے پالنے اور اس سے محبت کرنے والوں کی بھی ایک انجمن ہے اور وہ اپنے تصور کو عام کرنے کے لئے تحریک کا سہارا لیتے ہیں تو کتوں سے نفرت کرنے والے اور اسے مار ڈالنے والوں کی بھی انجمن ہے جو سماج کو کتوں سے پاک کرنے کی مہم چلایا کرتے ہیں۔ہم اپنے ملک میں بھی یہ دیکھتے ہیں کہ یہاں صوفیوں اور سادھوؤں کی انجمن بھی ہے،علماء اور مشائخ کی انجمن بھی ہے،ائمہ مساجد نے بھی اپنی انجمن بنا رکھی ہے تو اس کے مقابلے میں آزادیٔ رائے کے حمایتی زندگی کے تمام معاملات میں آزادی کو رواج دینے کی تحریک چلاتے نظر آتے ہیں۔اخلاق باختگی،ہم جنسی اور شہوت پرستی کے مراکز کا قیام اور اس کے استحکام کے لئے بھی اس ملک میں تحریکیں جنم لے رہی ہیں۔

علم وادب کی دنیا میں بھی مختلف نظریات کے فروغ،استحکام اور اشاعت کے لئے طرح طرح کے تصورات منظرِ عام پر آرہے ہیں اور اس کے لئے انجمن سازی کے ساتھ ساتھ تحریک کا سہارا بھی لیا جا رہا ہے۔اردو زبان میں ترقی پسند تحریک،جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی تحریک نے پورے ادبی منظر نامہ پر اپنی

موجودگی درج کرائی ہے تو اس کے بالمقابل تعمیر پسند ادبی تحریک ، انجمن تصوف پسند مصنفین اور انجمن جمہوریت پسند مصنفین جیسی تنظیمیں بھی یہاں اپنی سرگرمیاں دکھاتی نظر آتی ہیں ۔

تقریباً ستر سال پہلے بیسویں صدی کے ایک عظیم مفکر ، عالمِ دین اور داعیٔ حق مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے برصغیر میں دعوت اور اشاعت اسلام کی جب ایک ہمہ گیر مہم چھیڑی تو انہوں نے زبان و ادب کے میدان کو بھی اپنے دائرے میں سمیٹ کر اپنے حمایتیوں کو یہ ہدایت دی کہ وہ ایسی تحریریں دنیا کے سامنے پیش کریں جن میں انسانی اور اسلامی اخلاقیات کی بالادستی نظر آئے اور جس سے خدا بیزاری کے تصور کا قلع قمع ہو سکے ۔ مولانا موصوف کی اس تحریک پر لبیک کہتے ہوئے برصغیر میں ادارہ ادبِ اسلامی کا قیام عمل میں آیا اور اس ادارہ کے وابستگان نے تعمیری ادب کے فروغ کی باضابطہ مہم شروع کی ۔ اس تحریک سے وابستہ قلم کاروں نے اردو دنیا کے سامنے پورے حوصلہ کے ساتھ ایک بات رکھی کہ قلم اللہ کی امانت ہے اس امانت کے استعمال کے وقت ہمیشہ یہ بات نظر میں رکھی جانی چاہئے کہ آخرت میں جس طرح مال و دولت اور جوانی کے استعمال کا سوال ہوگا اسی طرح علم و دانش کے بارے میں بھی پوچھا جائے گا ۔ اس طرح مولانا موصوف نے قلم کاروں کو اس ذمہ داری کا احساس دلایا کہ نوکِ قلم سے کوئی ایسی تحریر نہ ٹپکے کہ جو آخرت میں قلم اور قلم کار کی شرمندگی کا سبب بن جائے ۔ سید قطب شہیدؒ نے اسی جذبہ کے پیشِ نظر یہ فرمایا ہے کہ جس انگلی سے اللہ کے وحدہٗ لاشریک ہونے کی شہادت دیتا ہوں اسی انگلی سے قلم پکڑ کر میں غیر اللہ کی حمایت کیسے کروں؟ چنانچہ تعمیر پسند ادبی تحریک کے وابستگان نے پوری ادبی دنیا میں یہ مہم چلا رکھی ہے کہ قلم کی ذمہ داری کو ذہن نشیں کرتے ہوئے قلم کاروں کو قلم کا استعمال کرنا چاہئے ۔ الحمدللہ اس کے گہرے اور بہتر اثرات آج کی علمی ادبی دنیا پر نظر آرہے ہیں ۔ ایک وقت تھا کہ جب اکبرالہ آبادی کی زبان میں ؎

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

کی کیفیت کم ہو رہی ہے ۔ یہ بات صاف طور پر محسوس کی جا رہی ہے کہ آج کا شاعر اور ادیب بلاتکلف اعلیٰ اخلاقی قدروں کو اپنا موضوع بنا کر ادب کی تخلیق کرنے میں مصروف ہے ۔ اردو افسانہ نے بھی اس تحریک کے

اثرات قبول کئے لیکن معیاری افسانہ نگاروں کی تعداد یہاں نہیں کے برابر ہے۔راقم الحروف کی اس موضوع پر تعمیر پسند رسائل کے مدیروں سے گفتگو ہوتی رہی ہے اور سبھوں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ فکشن نگاروں نے اس طرف کم توجہ کی ہے۔ماہنامہ ''دوام، نئی نسلیں، نمائندہ نئی نسلیں، ابلاغ، پیش رفت، حجاب اور ذکریٰ'' جیسے رسائل تعمیر پسند کہانیوں کی راہ دیکھتے نظر آتے ہیں۔

اس طرح تعمیر پسند فکشن نگاروں کے نقطۂ نظر سے قحط الرجال کی کیفیت نظر آتی ہے۔پرانے لکھنے والوں میں مولانا نعیم صدیقی کے بعد م نسیم، جیلانی بی اے، ابنِ فرید جیسے فکشن نگاروں نے اس راہ میں قدم رنجہ فرمایا لیکن ان پر تنقید نگاروں نے بہت کم توجہ کی حالاں کہ تعمیر پسند تنقید نگاروں کو یہ چاہئے تھا کہ ایسی تخلیقات کو زیر بحث لاکر فکشن کی دنیا میں نئی بحث چھیڑتے اور تعمیر پسندوں کے درمیان فکشن کے خدوخال پر گفتگو چلتی۔

ناچیز ۱۹۶۶ء سے مسلسل تعمیر پسند افسانے لکھ رہا ہے۔اس کے تین افسانوی مجموعے ۱۹۸۰ء سے ۲۰۰۹ء کے درمیان (آنگن آنگن، جنگل کا سفر اور بدلتے رُت کی کہانیاں) شائع ہوچکی ہیں لیکن ڈاکٹر احمد سجاد صاحب کے سوا کسی بھی تعمیر پسند تنقید نگار نے اس پر کوئی توجہ نہ کی۔جب کہ ہندوستان بھر کے مختلف دیگر تنقید نگاروں نے اس کی پذیرائی کی۔یہ کوئی ہلکی پھلکی بات نہیں ہے دیگر تحریکات سے وابستہ افراد واشخاص پر نظر کیجئے تو وہاں ذرے کو آفتاب بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔یہ صحیح ہے کہ ان میں سے ہر ذرہ آفتاب نہیں بن پاتا لیکن یہ تو ضرور ہوتا ہے کہ ایک زمانہ تک ویسے لوگ بھی منظرِ عام پر رہتے ہیں۔بہرحال! یہ بات برسبیلِ تذکرہ کے بطورِ صرف مثال کی ہے۔

اس وقت پیشِ نظر ڈاکٹر ابنِ فرید کا افسانوی مجموعہ مطبوعہ ۱۹۹۳ء ہے۔دس افسانوں پر مشتمل یہ کتاب 262 صفحات کو محیط ہے۔مجھ کو اس بات کا ملال ہے کہ تقریباً بیس سال بعد یہ کتاب میرے زیرِ مطالعہ آئی جب کہ ابنِ فرید صاحب تعمیر پسند افسانہ نگاروں میں سابقون اولون کا درجہ رکھتے ہیں۔مجھے نہیں معلوم کہ یہ افسانے رسالوں میں شائع بھی ہوئے ہیں۔شاید اسی وجہ سے موصوف کو ویسی عوامی شناسائی نہیں مل سکی آپ جس کے مستحق تھے۔یہ سبھی افسانے ۱۹۵۲ء سے ۱۹۹۱ء کے درمیان رقم کئے گئے ہیں۔یہ سب کے سب طویل ترین تحریریں ہیں۔سبھی افسانہ بیس سے بتیس صفحات کے درمیان قلم بند کئے گئے ہیں۔اس طرح اس طویل

افسانہ کو پڑھنے کے لئے نہ صرف یہ کہ وقت درکار ہے بلکہ ذہن کی شدید یکسوئی کی بھی حاجت ہے۔قاری کے ان افسانوں تک پہنچنے میں تاخیر کا یہ دوسرا سبب ہے۔تیسری بات یہ بھی ہے کہ آپ نے شگفتہ زبان استعمال کی ہے لیکن غیر ضروری طور پر انگریزی الفاظ کے استعمال نے بھی ان کی انشاء پردازی کی روانی کو متاثر کیا ہے۔اور آخری بات یہ ہے کہ جن موضوعات کو آپ نے اختیار کیا ہے اس کی تفصیل وطوالت نے اس کے مرکزی خیال کو موہوم کر دیا ہے۔

ابنِ فرید صاحب کی افسانہ نگاری کا یہ ایک رخ ہے۔اس کا دوسرا رخ بہت روشن ہے۔اولاً یہ کہ آپ کے پاس ایک واضح نظریہ ہے جس نظریہ کی پیشکش میں کہیں کہیں ٹھیٹھ انداز نظر آتا ہے لیکن بیشتر مقامات پر آپ نے کرداروں کی کردار سازی کرتے ہوئے وہ بات کہہ جانے کی کوشش کی ہے جو ان کا مافی الضمیر ہے۔دوئم یہ کہ آپ نے اپنی علمی زبان کو استعمال کر کے اپنے افسانوی زبان کے معیار اور وقار کو بلند کیا ہے۔گرچہ ان سے پہلے پریم چند نے سادہ بیانی کا سہارا لے کر افسانہ کو عوام الناس تک پہنچایا تھا۔ابنِ فرید صاحب نے عوام الناس سے منہ موڑ کر خواص اور طبقۂ اعلیٰ کے دانشوروں اور اہلِ نظر کے سامنے اپنی کہانیاں پیش کی ہیں۔دراصل ان کے پیشِ نظر ذہن سازی اور کردار سازی تھی اس لئے ذہن سازی کے لئے معیاری ذہن کی تلاش اور کردار سازی کے لئے معیاری کردار کی پیشکش ان کے افسانوں کا امتیازی وصف ہے۔

ان کے افسانوں کے مطالعہ سے یہ بات صاف طور پر سامنے آتی ہے کہ انہوں نے افسانہ نویسی کے ضابطوں کو نظر انداز کیا ہے۔قلم کو اپنے تخیل کے حوالے کر دیا ہے۔تخیل انہیں جہاں جہاں لے گیا ہے ان کا قلم وہاں وہاں ہوتا پھرا ہے جس کی وجہ سے پلاٹ بندی کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔لیکن اس سے افسانے کی دلچسپی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ان کا پہلا افسانہ ''عشرت لاج میں ایک اجنبی'' ہے۔جس میں انہوں نے محمد حسین آزاد کی طرح الفاظ کے طوطے مینے نہیں اڑائے ہیں بلکہ گل بوٹے بکھیرے ہیں۔طلسماتی انداز میں یکا یک افسانہ شروع ہو جاتا ہے۔چم چم نام کی لڑکی دوڑی دوڑی ثمّی کے پاس آتی ہے اور اسے یہ خوشخبری دیتی ہے کہ ''آج ہمارے یہاں ایک نئے گیسٹ آرہے ہیں''۔نام پوچھنے پر وہ کہتی ہے کہ ''بڑا میوزیکل نام ہے ان کا.....اسلم''،ثمّی کے لئے یہ بالکل اجنبی نام ہے لیکن یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ ایک نوجوان اس کے گھر

میں آج مہمان بن کر آنے والا ہے۔ شمّی مسرت محسوس کرتی ہے۔ یہ گھرانہ اپنے نام کی طرح ایک عشرت کدہ ہے جہاں کا ہر فرد عیش و عشرت کے لئے وقف ہے۔ یہاں انگریزی کے رسائل پڑھے جاتے ہیں جو اس زمانہ میں فیشن پرستی اور بے حیائی کو فروغ دینے کا ذریعہ تھے۔ صرف یہ سن کر کہ کوئی نیا نوجوان آنے والا ہے شمّی محوِ انتظار بن جاتی ہے:

> ''عشرت لاج کے عالی شان گیٹ کے باہر کسی بھی موٹر کی آواز پر ہماری نظروں کے سامنے الفاظ دھندلے ہو جاتے تھے اور ہم بے تابی سے گیٹ کی طرف دیکھنے لگتے لیکن پورٹیکو پر جھولتی ہوئی عشقِ پیچاں کی بیلوں کے اس پار گلاب کی روشوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا اور ہم جھنجھلا کر اٹھتے۔ یہاں تک کہ ہمارے دلوں میں نومیدی عود کرنے لگتی ہے''۔(ص:۹)

پھر انتظار کی یہ گھڑی ختم ہوتی ہے شمّی کے ڈیڈی ''مسٹر اسلم یو آر ویلکم'' کہہ کر اس کا استقبال کرتے ہیں لیکن وہ نوجوان انتہائی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ زمین پر قدم رکھتا ہے جسے دیکھ کر شمّی کی یہ کیفیت ہوتی ہے:

> ''ہمارے پروگراموں پر اوس پڑ گئی اور ہمیں اندیشہ سا ہونے لگا کہ ہمارے تعارفی عصرانوں کی ہماہمی اور بے پایاں مسرت، مکروہ بے اعتنائی کی نذر ہو جائے گی اور ہمارے یہ اجنبی مہمان ہماری ہویز میں ایک نمایاں پارٹنر نہ بن سکیں گے۔ ہمیں وہ اپنی ملائم، نوخیز چھوٹی سی ریشمی داڑھی کے پیچھے گئی گذری سی بات معلوم ہونے لگے اور ہمارا استعجاب اس طرح ٹھنڈا پڑ گیا جس طرح برساتی نالے میں اکتوبر کی لطیف خنک راتوں میں سکون پیدا ہو جاتا ہے''(ص:۹)

یہ دیکھ کر شمّی کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ '' آہ عشرت لاج عجب حقارت آمیز تنقید کا مرکز بن جائے گی''(ص:۱۰)

اب یہاں سے اسلم اس گھر میں ایک اجنبی کی طرح ایک لمبی مدت تک رہتا ہے۔ افسانہ نگار اسے اس گھر میں رکھ کر اس گھر کی ساری کیفیتوں کا پول کھولتا ہے۔ مثلاً یہ کہ فیضو نام کا ملازم انتہائی جبر و ظلم اور حقارت

آمیز برتاؤ سہہ کر اس گھر میں رہ رہا ہے۔ اسلم اس سے محبت کرتا ہے، اس کی انسانیت کو جگاتا ہے، اسے عزتِ نفس سکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بات شمی کو پسند نہیں آتی۔ اسلم اسے سمجھاتا ہے:

"ہاں ان دو روٹیوں کی ہی اہمیت تو تم اتنی زیادہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تم نے ان کے لئے اپنا سب کچھ کھو دیا" (ص:۱۲)

اس گھر کی یہ ایک تصویر ہے۔ اسی گھر میں ہیلن نام کی ایک پڑوسن لڑکی آیا جایا کرتی ہے جو شمی کے بھائی پیکو بھیا سے قربت رکھتی ہے۔ وہ قربت کہاں تک پہنچی ہوئی ہے شمی کے الفاظ اسے بیان کرتے ہیں:

"ابھی میں کوری ڈور میں پہنچی ہی تھی کہ کپڑوں کی سرسراہٹ گونج اٹھی اور ہیلن دیوار کا سہارا لے کر سنبھل کر کھڑی ہوگئی اور پیکو بھیا نے گھبراہٹ میں فون اٹھا کر رکھ دیا اور ڈرائنگ روم میں عجلت کے ساتھ چلے گئے" (ص:۱۳)

پیکو بھیا کے برخلاف اسلم کا حال شمی کے بقول یہ تھا:

"اسلم بھائی عشرت لاج کے ماحول میں کتنے اجنبی تھے بالکل زربفت میں ٹاٹ کا پیوند، ہم سوچ رہے تھے کیا یہ وہی اسلم بھائی ہیں جن کا نام سن کر ہم نے بڑا رومانی انداز لگایا تھا وہ تو ہمارے تصور کے اسلم بھائی سے اتنے مختلف تھے کہ ہمارے اندر ایک طرح کی قنوطیت پیدا ہوگئی، اسی وجہ سے تو ہم سب قنوطی ہوگئے تھے کہ وہ اسلم بھائی نہ تھے جیسے ہمارے تصور نے چاہا تھا، یہ تو ایک خواب تھا وہاں تو ایک وحشی ہرن تھا جو خوبصورت تو ضرور تھا لیکن وحشی تھا" (ص:۱۹)

اسلم اس گھر میں وحشی ہرن کیوں کہلایا۔ صرف اس لئے کہ وہ اس گھر کی تمام ایسی روش کو دیکھ کر جو اس کی نگاہ میں ناپسندیدہ تھی نہ صرف یہ کہ خود کو اس سے الگ کر لیتا تھا بلکہ وہ اس پر بے لاگ چبھتا ہوا تبصرہ بھی کرتا تھا۔ ہیلن کے چست لباس پر تبصرہ کرتے ہوئے اسلم نے کہا تھا:

"ہمیں چاہئے کہ ان کے نفس کو تلذذ کے ایسے مواقع فراہم نہ کریں جو ان کو اور بھی زیادہ بے باک بناتے چلے جائیں"۔

جواباً شمی کہتی ہے:

''مگر ہمیں افسوس ہے کہ ہم سینئس اور نس نہیں بن سکتے ہم اپنے آپ کو خوشیوں سے محروم کر کے ادبی حزن میں مبتلا نہیں کر سکتے'' (ص:۲۰)

ایسے تبصروں سے شمی نے اسلم کے متعلق یہ خوب اندازہ لگالیا کہ اس کے گھر میں اسلم کا جو وقت گذر رہا ہے وہ اسلم کو گھر کے مطابق نہیں بنا سکتا اور گھر کے یہ نوجوان اسلم کی فکر سے میل نہیں کھا سکتے:

''دن آہستہ خرامی سے گزرتے رہے اور اسلم بھائی خود کو عقائد پرست ملّا ثابت کرتے رہے۔ دنیا سے وہ پیچھے بھاگتے رہے، زمانہ کے رخ سے ہٹتے رہے بالکل ان پیڑوں کی طرح جو ایک چلتی ہوئی ریل میں سے دور میدان کے آخری وسعت پر الٹی سمت بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں''۔ (ص:۲۱)

گھر کے یہ نوجوان اپنے ہی گھر میں سخت اضطراب کے شکار ہو جاتے ہیں:

''میرے اللہ اس عظیم تبدیلی نے تو جیسے ہماری روحوں کو مضمحل کر دیا تھا جیسے کوئی ہم سے ہماری عزیز عشرت لاج چھیننے لئے جا رہا تھا یا جیسے وہ خود ہی ہم سے دور ہوتی چلی جا رہی تھی، بس دل کی یہ خواہش دل میں رہی کہ اسلم بھائی جو کانٹا بن کر ہماری دلچسپیوں میں بھٹک رہے تھے یا تو نکل جائیں یا اپنے طور پر بدل کر ہماری محفل میں شریک ہو جائیں''۔ (ص:۲۲)

لیکن اسلم اپنے موقف پر جما ہوا ہے وہ نوجوانوں کو سمجھاتا ہے:

''دنیا سمجھتی ہے کہ ہم آسودہ ہیں، ہم امیر ہیں، ہم اعلیٰ طبقے کے ہیں۔ بظاہر پرسکون لیکن بہ باطن کتنی کھوکھلی ہے ہماری زندگی'' (ص:۲۴)۔

لیکن یہ تبصرہ اپنا منفی اثر دکھاتا ہے:

''میں اسلم بھائی سے پوری طرح متنفر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ان کی یہ حرکت ہماری روایات پر بہت بڑی ضرب تھی اور جس کو برداشت کرنے کے لئے ہم بالکل تیار نہ

تھے''(ص:۲۵)

گزرتے ہوئے ان حالات میں ایک ایسی شب بھی آئی کہ جب شمّی ،ہیلن ،پیکو اور اس کا ساتھی فوزی ایک چاندنی شب میں کشتی بانی کا لطف اٹھانے کے لئے ندی کے سینے پر اتر جاتا ہے جہاں آہستہ آہستہ ہیلن اور پیکو حد سے گزر جانے کا موڈ بنا رہے ہوتے ہیں ۔فوزی بھی شمّی سے کچھ ایسی ہی آرزو رکھتا ہے کہ یکا یک شمّی کے اندر کی عورت جاگ جاتی ہے:

''فوزی کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں وحشت سی جھلک رہی تھی جس پر شاید کبھی میں نے غور نہ کیا ہو اور جو اس وقت بُری طرح کھٹک رہی تھی ۔اس وحشت میں نہ معلوم کیسی بھوک سی ملی ہوئی نظر آرہی تھی ۔ مجھے ایک دم اسلم بھائی کا سوال پھر یاد آ گیا اور میرا دل بری طرح گھبرانے لگا''(ص:۳۲)

اور تب اس کے اندر ایک کیفیت پیدا ہوئی ۔اس نے کشتی کو زبردستی کنارے لگانے کو کہا وہاں سے بھاگ کر اپنے گھر آئی جہاں بستر پر لیٹنے کے بعد اسے اپنا کمرہ کیسا محسوس ہوا ملاحظہ فرمایئے:

''اور سامنے ریکس میں اور بستر کے پاس میز پر کوٹیرا اور لائف کے بکھرے ہوئے پرچے مادرزاد برہنہ بیسوا نظر آنے لگے، کٹی کے سرورق پر بنی ہوئی امریکی لڑکی کے گالوں اور ہونٹوں کی سرخی لٹی ہوئی عصمت کا خون بن کر طاری ہونے لگی ،اف میرے حلق میں ہزاروں زخمی پرندے پھڑ پھڑا رہے تھے میرا دم گھٹا جا رہا تھا''(ص:۳۴)

اسی عالم میں شمّی سو گئی ۔عالمِ خواب میں جو کچھ اس نے دیکھا وہ کچھ اس طرح تھا:

''فوزی کی آنکھوں میں وحشت سی عود کرنے لگی ،اس نے میرے رخساروں میں اپنے نوکیلے ناخن پیوست کر دئے وہ میرا خون چاٹتا رہا اور وحشت ناک قہقہے لگاتا رہا اور دور بہت دور سے چم چم کی دردناک کراہ آرہی تھی ۔وہ چیخ چیخ کر مجھے پکار رہی تھی بچاؤ بچاؤ مجھے بچاؤ ،اور فوزی برابر میرے رخساروں سے بہتا ہوا خون چاٹتا رہا اور قہقہے لگاتا رہا۔ اس کی خونی آنکھوں سے درندگی برابر جھلکتی رہی اور میں نڈھال ہوتی چلی گئی ،معاً اسلم

بھائی نے اپنے کمرے کے دریچے سے جھانک کر دیکھا اور میری کھوئی ہوئی آواز نہ معلوم کہاں سے واپس آ گئی۔ میں ایک دم چیخ اٹھی'' (ص: ۳۵۔۳۶)

شمّی کا خواب جب ٹوٹا تو اس نے محسوس کیا:

''صبح صادق کی نورانی کرنیں فرشتوں کی طرح چپکے چپکے داخل ہو رہی تھی اور گلاب کے پھولوں کی حیات پرور خوشبو ان کرنوں میں لپٹی ہوئی داخل ہو رہی تھی'' (ص: ۳۸)۔

عشرت لاج کی کہانی یہاں آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ ابنِ فرید صاحب کی یہ مثالیت پسندی لمبے سفر طے کرتی ہوئی نمایاں ہو کر سامنے آ گئی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ابن فرید صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی مثالیت پسندانہ فطرت کی تسکین کے لئے لکھا۔ کاش انہوں نے فکشن کے اصولوں کا اہتمام بھی کیا ہوتا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اس کتاب میں ان کے کل دس افسانے درج ہیں جو طوالت کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہیں۔ جس افسانہ پر گفتگو کی گئی وہ ان کی پہلی تخلیق ہے۔ وہ ایک سال میں بہ مشکل ایک افسانہ لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۵۷ء میں انہوں نے دو افسانے قلم بند کئے۔ میں تھوڑی تھوڑی گفتگو ان دو افسانوں پر بھی کرنا چاہوں گا۔ اس سلسلے کا ان کا پہلا افسانہ ''ساحل سے طوفاں کا نظارا'' ہے جسے انہوں نے قدرے ڈرامائی انداز میں قلم بند کیا ہے۔ اس کے چار ذیلی عنوانات ہیں۔ پہلا عنوان ''نظارا'' ہے۔ جس میں یہ بات دکھائی جا رہی ہے کہ میں جو شاید خود افسانہ نگار بھی ہو سکتا ہے یا پھر اس کا بھائی۔ میں اپنے دریچے میں کھڑا سڑک کی جانب دیکھ رہا ہے جہاں سے اس کے بڑے بھائی اکمل پرسکون انداز میں گزر رہے ہیں:

''ان کی سادگی میں سنگار ہوتا ہے، ان کی سنجیدگی میں تبسم ہوتا ہے، ان کے قدموں میں اعتماد ہوتا ہے پہاڑوں کی طرح ان کی نگاہوں میں گہرائی ہوتی ہے نیلے نیلے سمندروں کی طرح'' (ص: ۱۰۲)

''ان کو ان کے والد محترم نے گھر سے نکال دیا ہے۔ میں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ انہیں کیوں نکالا گیا ہے وہ اپنے ابا جان سے پوچھنا چاہتا ہے کہ ''آخر آپ نے بھائی جان کو کیوں نکال دیا'' (ص: ۱۰۳)۔

اگلے عنوان ''ساحل'' میں یہ بات بتائی جاتی ہے کہ عظمت انتہائی ذہین طالب علم تھا جس سے والدین کو یہ امید تھی کہ مقابلہ جاتی امتحان میں شریک ہو کر سول سروس کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہو جائے گا۔ اکمل کا نشانہ بھی کچھ ایسا ہی تھا چنانچہ اس کی زندگی اسی نام جھام کے ساتھ گذر رہی تھی:

''بھائی جان سفید پاجامے اور سیاہ شیروانی میں یوں نستعلیق انداز میں فرزانہ کے ساتھ دور فوارہ کے پاس والی میز پر بیٹھے ہوئے تھے کہ جیسے ابھی ان کے کوئی مصور دوست ان کی روغنی تصویر شروع کر دیں گے۔ فرزانہ اپنی چلبلی فطرت پر کسی طرح قابو نہیں پا رہی تھی'' (ص:۱۱۱)

کہ اسی دوران میں مبشر نام کے ایک صاحب سے اکمل کی ملاقات ہوگئی۔ یہ ملاقات قربت میں بدل گئی اور کچھ ہی دنوں کے بعد اکمل مبشر صاحب کا ہم نوا بن گیا۔ اکمل کو یہ احساس ہوا کہ:

''جیسے اب تک وہ خلاؤں میں بستے تھے اور اب پہلی بار ان کا تعارف انسانوں سے ہوا ہو''۔ (ص:۱۱۵)۔

''یونیورسٹی کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر جانے کے بعد اکمل کی زندگی نے ایک نئی راہ اختیار کر لی۔ میں کو مسلسل فکر تھی، انتظار تھا کہ سول سروس کے مقابلوں کی تاریخ کا اعلان ہو اور وہ بھائی جان کو اس کی خوشخبری سنا سکیں، تاریخوں کا انتظار ہوتا رہا بھائی جان مبشر صاحب کے نزدیک ہوتے گئے۔ ان کی زندگی میں تبدیلیاں ہوتی چلی جا رہی تھیں اور میں حیران تھا'' (ص:۱۱۶)

''پھر ایک دن وہ بھی آیا کہ جب اکمل ''وہ شان چھوڑ کر نہ معلوم کس دنیا میں چلے گئے تھے، ان کا ماحول بدل چکا تھا، انسان بدل چکے تھے'' (ص:۱۲۱)۔

اس بدلے ہوئے انسان کے سامنے اس کے ابا جان نے اس سے کہا ''اکمل دیکھو یہ مقابلے کا اعلان ہو گیا ہے'' (ص:۱۲۱)۔

''ابا جان انسانوں پر خدائی کرنے کو میرا دل آمادہ نہیں ہو رہا ہے''۔

''پاگل نہ بنو تمہیں اپنے مستقبل کی فکر کرنی ہوگی''

''ابا جان مجھے تباہ کن مشنری کا پرزہ نہ بنایئے۔ آخر میں اپنی روح کا کیا کروں۔ صرف دنیا میری پیاس نہ بجھا سکے گی''۔ (ص:۱۲۲)

ابا جان جب گم ہو گئے تو امی جان نے بڑھ کر سمجھایا:

''میرے بچے تمہیں نہ معلوم کیا ہو گیا ہے ایک جج کا بیٹا اس طرح زندگی گزارے گا دنیا کیا کہے گی''

''امی جان دنیا سے اس قدر ڈرنے والے نہیں''

اور میں کے سامنے یہ سوال کھڑا ہو گیا:

''بھائی جان آخر پر رعونت زندگی کے مقابلے میں اس پُرخطر زندگی کے لئے کیوں کر تیار ہو گئے ہیں''۔ (ص:۱۲۳)

اس کی امی جان کو اس کے ابا جان نے یہ اطلاع دی کہ ان کا بیٹا خدمتِ خلق میں مصروف ہو گیا ہے:

''شہر کے اس غلیظ حصہ میں جو فساد ہو گیا تھا نا، اس کی امدادی مہم میں سرگرم ہے۔ وہ بد نصیب گورکنوں کی طرح لاشیں ڈھو رہا ہے۔ حلال خوروں کی طرح زخمیوں کی مرہم پٹی کر رہا ہے، ان کی غلاظتیں ڈھو رہا ہے، گداگروں کی طرح جلے ہوئے گھروں، دکانوں کے لئے چندا جمع کر رہا ہے'' (ص:۱۲۶)۔

''لیکن اسے تو اپنی عزت احترام کا بھی پاس نہیں۔ کیا منہ دکھاؤں گا میں لوگوں کو جب انہیں معلوم ہو گا کہ میرا لڑکا دروازے دروازے چیتھڑے کوڑے جمع کرتا اور ہاتھ میں چندے کا ڈبہ لئے پھرتا رہا ہے'' (ص:۱۲۷)

ان ہی حالات میں میں کے ''بھائی جان چلے گئے اور انہوں نے الگ دنیا بسالی۔ ہم سے بالکل مختلف، بالکل انوکھی۔

اس کے بعد تیسرا منظر نامہ ''ساحل سے نظارہ'' میں پیش کیا گیا ہے:

''کیا جانے ان کی دنیا میں کتنا سکون تھا، کتنا آرام تھا، کتنی طمانیت تھی کہ وہ اس کے ہی ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے سوسائٹی کھوئی، وقار اور افتخار کھویا لیکن پھر بھی نہ معلوم لوگ اب بھی ان کی اتنی ہی تعظیم کرتے ہیں بلکہ پہلے سے کہیں بڑھ کر محبت کرتے ہیں''۔

''لیکن جب بھائی جان نے ابا جان کے اس گمان کو گمان ہی ثابت کر دیا تو ابا جان کی گرج دار آواز میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ ان کے اٹل احکامات میں تزلزل پیدا ہو گیا۔ امی جان افسردہ اور زخم خوردہ سی رہ گئیں اور باجی کے سینے سے جیسے ہوک سی اٹھتی تھی اپنے بھائی کے لئے۔ اس حالت میں میں نے ایک دن بھائی جان کا راستہ روک لیا''۔

''بھائی جان واپس آجایئے آپ۔ میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے''۔

''ابا جان بھی اجازت دیں گے'' انہوں نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ جواب دیا۔

میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں خاموش رہا۔

''مجھے اس منجدھار ہی میں رہنے دو صغیر''۔

انہوں نے میری پیٹھ تھپتھپائی اور چلے گئے۔

''میں دور تک ان کے متوازن قدموں کو نظر جمائے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ انہوں نے ہماری ساری ہی زنجیروں کو بکھیر کر رکھ دیا تھا۔''(ص:۱۳۰)

یہ اس کہانی کا آخری باب تھا ''ساحل سے نظارہ'' یہاں بھی افسانہ نگار کی وہی مثالیت پسندی اپنے جلوے دکھا رہی ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار صغیر ہے یا اکمل۔

۱۹۵۷ء ہی کا تحریر کردہ ان کا ایک افسانہ ''چاند سمندر اور شہر'' ہے۔ جس میں دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کا دردناک اور عبرت ناک نقشہ کھینچا گیا ہے۔ سنگاپور کا منظر نامہ ہے۔ یہ شہر جب دوسری بار بسا ہے تو اس کے سامنے بھوک کا مسئلہ ہے، انگنت لوگوں کے کھیت ہو جانے کے بعد ان کی عورتیں کس طرح عصمت فروشی کے لئے مجبور ہو گئی ہیں اور فاتح فوجیں کس طرح ان کا استحصال کر رہی ہیں۔ چند سکوں کی خاطر ان کی

عصمتیں لوٹی جارہی ہیں ۔اس کے بہت سارے مناظر اس میں دکھائی گئے ہیں ۔ایک جگہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عورتیں ننگا ناچ کرتی ہیں تو اسے حیرت ہوتی ہے کہ ''ایک عورت پیسہ کمانے کے لئے اسٹیج پر عریاں ناچ سکتی ہے یہ بھی ہوسکتا ہے''(ص:۱۶۵)

یہ سن کر وہ سوچتا ہے کہ مغرب میں ''عورت برسرِ عام ناچتی رہی اور مرد نچاتا رہا۔عورت کو خوش گمانی ہے کہ وہ آزاد ہے اور مرد فاتحانہ طنزیہ ہنسی ہنستا ہے''(ص:۱۶۶)۔

''جنگ سے زبوں حال باشندے وحشت زدہ ہوکر بھاگ رہے تھے،گولیوں کا نشانہ بن کر لاشوں میں اضافہ کر رہے تھے۔شاہی گورے بھاگتے ہوئے ہر اسانوں میں سے اپنی ہوس کے شکار چن رہے تھے ان کے ماں باپ، بھائی بہن شرم سے اپنی آنکھیں بند کر کے ہاتھوں سے اپنے چہرے ڈھانپ رہے تھے''(ص:۱۶۷)

وہ ایک ٹانیے کے لئے گیلری میں کھڑا میں کھڑا ہوگیا۔پاس سے گذرتی ہوئی سروس گرل نے اسے بیٹھنے کی دعوت دی مگر وہ اس وقت سکون وتنہائی چاہتا تھا۔

''کچھ گورے ملایائی لڑکوں سے بھونڈے شہوانی مذاق کر رہے تھے۔کچھ ان کے ساتھ خود گھل مل گئی تھیں''(ص:۱۷۵)

وہ شخص جوان حالات میں جا کر پھنس گیا ہے وہ جلد سے جلد اپنے گھر واپس آجانا چاہتا ہے اور آکر اپنے لوگوں کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ:

''تمہاری سرزمین میں تمہارے ہی مشرق میں،تمہاری ہی بہو بیٹیوں کو میں دیکھ رہا ہوں ۔میں مانتا ہوں وہ اپنی روزی خود تلاش کرتی ہیں،خود کماتی ہیں،خود زندہ رہتی ہیں ۔لیکن تم ذرا ہوکس بے پرجا کر اس لڑکی سے پوچھو جس کی آنکھوں میں ایک بجے تک جاگتے رہنے اور ہوکس بے کے تماشائیوں کو سونگھتے پھرتے رہنے سے مرچیں سی لگتی محسوس ہونے لگتی ہیں کہ اسے اس طرح زندہ رہنے میں کتنا آرام محسوس ہو رہا ہے ۔''(ص:۱۷۵)

اس طرح اس کہانی میں انہوں نے دوسری جنگِ عظیم کے بعد کا منظر نامہ پیش کرتے ہوئے اپنے لوگوں کو یہی پیغام دینا چاہا ہے کہ مغرب کی چمک دمک کے اندرون میں اتر کر دیکھو کہ ان کے دل کتنے زخمی ہیں، ان کی تمنائیں کس قدر ریزہ ریزہ ہو چکی ہیں، ان کا وجود کس طرح کرب والم کا مرکز بنا ہوا ہے۔

اسِ فرید صاحب ن ے افسانہ کے فن پر کوئی توجہ نہیں کی حالاں کہ ان کے سامنے اردو میں افسانہ نگاری کی مضبوط روایت موجود تھی۔ پھر ہم اسے قابلِ معافی اس لئے گردانتے ہیں کہ بہر حال۔ع

''نقاش نقش ثانی بہتر کشد زاول''

یہ دراصل تعمیر پسندانہ افکار کا اپنا امتیاز ہے کہ جس میں انسان کی عظمت اس کے اخلاقیات کو زندہ اور قائم رکھنے کی کوشش اور فواحش ومنکرات کی سرکوبی کا مزاج پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جب تک اس مادی دنیا کے نمائشوں کی بخیہ نہیں ادھیڑی جائے گی اس وقت تک اس کی اصل حیثیت دنیا کے سامنے نہیں آسکے گی اور وہ سماج جو اخلاق مندی کی بنیاد پر قائم ہے جس میں شرافت کی قدر کی جاتی ہے اور جہاں عدل ومساوات کے قیام کی جد وجہد جاری رہتی ہے اس سماج کی سربلندی اور غلبہ کا ماحول پیدا نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے اردو زبان وادب کے وقار اور معیار کو قائم رکھنے کے لئے تعمیری ادب کی تخلیق اور تشکیل ضروری ہے۔ع

اے زفرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

اردو کا تخلیقی مزاج

پروفیسر منصور عمر

ہر زبان اپنی پشت پر ایک مکمل تہذیب و ثقافت رکھتی ہے اور ہر تہذیب و ثقافت کا تعلق براہ راست کسی نہ کسی مذہب سے ہوتا ہے۔ اور ہر مذہب کی بنیاد اخلاقی اقدار پر ہوتی ہے۔ اور ہر زبان اپنے تخلیقی مزاج و منہاج سے پہچانی جاتی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو اردو زبان کی تعمیر میں ایک تہذیبی ثقافت اور اخلاقی اقدار کا قوام شامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف مذاہب اور مذہب اسلام کی آمیزش سے ایک نئی تہذیب و ثقافت کا جنم ہوا جس نے آگے چل کر قومی تہذیب کا درجہ حاصل کرلیا۔ یہی وہ تہذیب ہے جو تقریباً ایک ہزار سال تک ہندوستان میں قوی تر تہذیب کی حیثیت سے غالب رہی اور آج بھی یہ تہذیب تمام تر دشواریوں کے باوجود زندہ و پایندہ ہے۔ اسی تہذیب کے تحت اردو زبان و ادب نے ترقی کی راہیں طے کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اردو زبان و ادب کے تخلیقی مزاج میں بھی وہی عناصر شامل ہیں جو اس قومی تہذیب کے عناصر ترکیبی رہے ہیں۔

کوئی بھی تہذیب یونہی نہیں بارآور ہوتی ہے بلکہ اس کے پیچھے سماجی، سیاسی، معاشی اور مذہبی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس طرح کے سماجی عوامل کارفرما ہوں گے اسی طرح کی تہذیب بھی ہوگی۔ لیکن چونکہ تمام مذاہب کی قدریں کم و بیش یکساں ہوتی ہیں اس لئے ان میں انسانیت کا بول بالا ہوتا ہے۔ مذاہب عالم کا مطالعہ کیا جائے تو ہم پاتے ہیں کہ خیر و شر، نیکی و بدی، ایمانداری و بے ایمانی اور دنیا و آخرت کا تصور تمام مذاہب میں روح کی طرح جاری و ساری ہے۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ تہذیبیں قوموں سے بنتی ہیں اور مختلف قوموں کے نظریات و خیالات اور تجربات و مشاہدات الگ الگ ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا مودودی نے ''مختلف مذاہب کے تصورات'' کے تحت جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تہذیب کی حیثیت اندھوں کے درمیان ہاتھی کی ہے۔ مودودی صاحب کے مطابق:۔

۱۔''ایک گروہ نے انسان کی کمزوری اور بے بسی اور اس کے مقابلے میں فطرت کی بڑی بڑی طاقتوں کی شوکت و جبروت کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ دنیا میں وہ ایک نہایت ہی حقیر ہستی ہے۔اور یہ نافع و ضار قومیں جو دنیا میں نظر آتی ہیں کسی عالم گیر قانون کی تابع نہیں ہیں بلکہ خودمختار یا نیم خودمختار طاقتیں ہیں۔بت پرستی،شجر پرستی،ستارہ پرستی اور دوسرے قوائے فطرت کی پرستش اسی نظریہ کہ پیداوار ہے۔''

۲۔''دوسرے گروہ نے دنیا کو اس نظر سے دیکھا کہ اس میں بس فساد ہی فساد ہے۔تمام کارخانہ ہستی اس لئے چل رہا ہے کہ انسان کو تکلیف اور رنج والم پہنچائے۔اس تخیل نے ان لوگوں کے لئے دنیا اور اس کی زندگی میں کوئی دلچسپی باقی نہ چھوڑی اور انہوں نے اپنے لئے نجات کی راہ اس میں دیکھی کہ دنیا سے کنارہ کش ہو جائیں۔''

۳۔''ایک اور گروہ نے دنیا کو اس طرح سے دیکھا کہ اس میں انسان کے لئے لذت وعیش کے سامان فراہم ہیں اور اس کو ایک تھوڑی سی مدت ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے مل گئی ہے۔آدمی کے لئے جو کچھ بھی ہے یہی دنیا ہے اور اس کو جو کچھ مزے اڑانے ہیں اسی دنیوی زندگی میں اڑانے ہیں،موت کے بعد نہ وہ ہوگا،نہ دنیا ہوگی،نہ اس کی لذتیں ہوں گی۔''

۴۔''ایک گروہ ایسا ہے جو دنیا اور اس کی لذتوں اور مسرتوں بلکہ خود دنیوی زندگی ہی کو سراسر گناہ سمجھتا ہے۔''

۵۔''ایک اور گروہ نے قانون فطرت کی ہمہ گیری کو دیکھ کر انسان کو ایک مجبور محض ہستی سمجھ لیا۔فطرت کے قانون نے اس کو بالکل جکڑ رکھا ہے،وہ اس قانون کے خلاف نہ کچھ سوچ سکتا ہے،نہ کسی چیز کا ارادہ کر سکتا ہے اور نہ کوئی حرکت کرنے پر قادر ہے،لہٰذا اس پر اپنے کسی فعل کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔''

۶۔''اس کے بالکل برعکس ایک گروہ کی نگاہ میں انسان نہ صرف ایک صاحب ارادہ ہستی

ہے، بلکہ وہ کسی بالاتر ارادہ کا تابع اور کسی اعلیٰ طاقت کا مطیع وفرماں بردار نہیں ہے۔''

(اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی ص:۵۶،۶۰)

ظاہر ہے کہ یہ تصورات مختلف نوعیت کے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی قابل قبول نہیں ہے۔ان تصورات کے تحت جو تہذیبیں وجود میں آئیں اور دنیا میں موجود ہیں ہم ان کا حشر دیکھ رہے ہیں۔اس کے برعکس ''زندگی کے تمام تصورات میں صرف اسلام ہی کا تصور ایک ایسا تصور ہے جو فطرت اور حقیقت کے مطابق ہے۔''لیکن ہم جانتے ہیں کہ نہ تو اسلام کوئی جامد وساکت مذہب ہے اور نہ ہی تہذیب بلکہ اس میں زندگی اور زندگی سے متعلق تمام عوامل کی کارفرمائی ہوتی ہے۔مولانا مودودی کے مطابق دنیا کی ہر تہذیب درج ذیل پانچ عناصر سے بنی ہیں:

۱۔دنیوی زندگی کا تصور　۲۔زندگی کا نصب العین　۳۔اساس عقائد وافکار

۴۔تربیت افراد　۵۔نظام اجتماعی　(اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی،ص:۱۱)

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ادب اور تہذیب ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں کیونکہ ادب بھی ان ہی عناصر ترکیبی سے مرکب ہے جن سے تہذیب وثقافت۔بقول سید احتشام حسین:

> ''تہذیب ایک ملک کے فنون لطیفہ،ادب،فلسفیانہ خیالات،طرز معاشرت،مادی ترقی اور زندگی کے متضاد اور متصادم عناصر کو متوازن بنا کر اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی کا ایک خوشگوار احساس پیدا کرنے سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔جب ہم لفظ تہذیب استعمال کرتے ہیں تو اس سے کسی قوم یا ملک کی داخلی یا خارجی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں سے مجموعی طور پر پیدا ہونے والی وہ امتیازی خصوصیات مراد ہوتی ہیں جنہیں اس ملک کے لوگ عزیز رکھتے ہیں اور جن کے حوالے سے وہ دنیا میں پہچانا جاتا ہے۔انسان قدروں کے بنانے اور محفوظ رکھنے کی جدوجہد میں اپنی قومی تہذیب پیدا کرتا ہے،وہ تہذیب اس کے ماضی سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور دنیا کی عام رفتار ترقی سے نسبت رکھتی ہے۔ تہذیب قومی زندگی کی ساری جذباتی،روحانی اور مادی امنگوں اور خواہشوں کا احاطہ

کر لیتی ہے، اس کو بناتی سنوارتی ہے۔ اسے ایک ایسا نصب العین بخشتی ہے جو زمانے کی ضروریات کا ساتھ دے سکے وہ ان ساری طاقتوں کو سمیٹے ہوئے آگے بڑھتی ہے جو ماضی نے اسے عطا کی ہیں۔''(ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر، ص:۱۹۹)

تہذیب کی مذکورہ تعریف بہت ہی اہمیت کی حامل ہے لیکن مولانا مودودی اس کو تہذیب کے بجائے تہذیب کے نتائج قرار دیتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ:

''لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کی تہذیب نام ہے اس کے علوم و آداب، فنون لطیفہ، صنائع و بدائع، اطوار معاشرت، انداز تمدن اور طرز سیاست کا۔ مگر حقیقت میں یہ نفس تہذیب نہیں ہیں، تہذیب کے نتائج و مظاہر ہیں۔ تہذیب کی اصل نہیں ہیں۔ شجر تہذیب کے برگ و بار ہیں۔''(اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ص:۸)

سید عابد حسین تہذیب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

''تہذیب نام ہے اقدار کے ہم آہنگ شعور کا جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے، جسے وہ اپنے اجتماعی ادارت میں ایک معروضی شکل دیتی ہے، جسے افراد اپنے جذبات و رجحانات، اپنے سبھاؤ اور برتاؤ میں اور ان اثرات میں ظاہر کرتے ہیں جو وہ مادی اشیاء پر ڈالتے ہیں۔''(قومی تہذیب کا مسئلہ، ص:۱۱)

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہر تہذیب کی ایک مخصوص زبان ہوتی ہے یا پھر وہ ایک مشترک زبان کی پروردہ ہوتی ہے اور یہ مشترک زبان اسے قومی تہذیب کا درجہ عطا کر دیتی ہے۔ اس سلسلے میں سید عابد حسین کی رائے بہت ہی اہم ہے وہ کہتے ہیں کہ:۔

''مشترکہ زبان کی حیثیت کسی زبان کی تہذیب میں صرف اتنی ہی نہیں کہ وہ اس کے افراد کے درمیان تبادلۂ خیالات کا اور اشتراک عمل کا ذریعہ ہے بلکہ وہ اس تہذیبی روایات کے نشہ اور نقل کے وسیلے کے طور پر بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ ایک طلسمی شراب ہے جس کے اندر جماعت کے مشترک احساسات، جذبات، مزاج، روایات و

دستور کی روح کھنچ کر آ گئی ہے اور جس کو پی کر جماعت کے افراد ایک ہی کیف میں ڈوب جاتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ کسی ملک میں صحیح معنی میں قومی تہذیب اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب سارے ملک کی زبان ایک ہوگئی ہو یا کم سے کم مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ ایک مشترک زبان بھی پیدا ہو چکی ہو۔'' (قومی تہذیب کا مسئلہ، ص: ۲۰۴، ۲۰۵)

اس بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو نہ صرف یہ کہ ایک مشترک قومی زبان کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اسے ایک قومی تہذیب کا بھی درجہ حاصل ہے۔ جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور آج بھی یہ ہندوستان کی سب سے بڑی سیکولر زبان ہے۔ چنانچہ اس کا تخلیقی مزاج بھی وہی ہے جو قومی تہذیب کا ہے۔ اردو زبان اپنی ابتدا سے ہی ہندوستانی تہذیب، موسم، مزاج اور خوشبو سے رچی بسی رہی ہے اور سیکولر ہونے کے باوجود مذہب اس کی گھٹی میں داخل رہا ہے۔ اور آج بھی جبکہ یہ قومی تہذیب دو قومی تہذیب میں تبدیل ہو چکی ہے اپنے ہر کام کی ابتدا مذہبی رسوم کے تحت ہوتی ہے۔ چنانچہ اردو کے تمام شعرائے کرام کے یہاں حمد، نعت اور منقبت کے اشعار لازماً ملتے ہیں مثلاً اردو کے پہلے شاعر حضرت امیر خسرو کو لے لیجئے، ایک طرف وہ مختلف درباروں سے بھی وابستہ رہے اور دوسری طرف مختلف موسیقی کے موجد اور اصناف ادب کے خالق۔ چونکہ اردو زبان کی پیدائش میں فارسی، عربی اور سنسکرت کا قوام شامل ہے اس لئے اس کے ادب پارے بھی مذہبیات سے خالی نہیں ہیں۔ حضرت امیر خسرو کہتے ہیں:

گوری سوئے سیج پر، مکھ پر ڈارے کیس　　چل خسرو گھر آپنے، رین بھئی چہو دیس

مذکورہ شعر کے پس منظر، معنی و مفہوم سے ہم سب واقف ہیں اس لئے یہاں اس کی تعبیر و تشریح کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ ہی گنجائش۔ امیر خسرو کا دوہا ہو یا ریختہ، کہہ مکرنی ہو یا پہیلی یا پھر فی البدیہہ کہنے کا ملکہ ہر جگہ وہ یکتائے روزگار نظر آتے ہیں اور ہندوستانی تہذیب کے نمائندہ مثلاً ایک پہیلی ملاحظہ ہو:۔ ایک تھال موتیوں سے بھرا = سب کے سر پر اوندھا دھرا = چاروں اور وہ تھال پھرے = ایک نہ موتی اس کے گرے

یا پھر حاضر جوابی کی مثال:۔　　کھیر پکائی جتن سے چرخا دیا جلا = کتا آیا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول

ہجا= چل پانی پلا

مشت نمونہ از خروارے کے طور پر چند معروف شعراء کے دواوین کی پہلی غزل کا پہلا شعر پیش کرنا چاہوں گا۔ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے سامنے کوئی نمونہ نہیں تھا پھر بھی اس نے فارسی شاعری سے متاثر ہو کر اپنے دیوان کی ترتیب میں حمدیا حمدیہ غزل کو اہمیت دی ملاحظہ ہوں:

بندا ہوں گنہ گار، خدا میرا گنہ بخش تجھ لطف کیرا فیض خدا مجکوں سدا بخش

(محمد قلی قطب شاہ)

کچھ دوسرے شعراء کے دواوین سے مثالیں پیش خدمت ہیں:

کیتا ہوں تیرے ناؤں کو میں درد زباں کا کیتا ہوں تیرے شکر کو عنوان بیاں کا

(ولی دکنی)

ہر مو زباں ہوا ہے ہمارا جدا جدا کہتا ہوں ہر زباں میں سیں دن خدا خدا

(آبرو)

تھا مستعار، حسن سے اس کے جو نور تھا خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

(میر)

مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا جوں شمع سراپا ہوا گر صرف زباں کا

(سودا)

بیعت خدا سے مجھکو ہے بے واسطہ نصیب دست خدا ہے نام مرے دست گیر کا

(ناسخ)

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا حقا، کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

(درد)

ہوا حمد خدا میں دل جو مصروف رقم میرا الف الحمد کا سا بن گیا کویا قلم میرا

(ذوق)

نہ کیونکر مطلع دیواں ہو مطلع سرِّ وحدت کا　　کہ ہاتھ آیا ہے روشن مصرعہ انگشت شہادت کا

(مومنؔ)

مرزا غالب جیسے جدید شاعر نے غزل کے رنگ و آہنگ میں جو تبدیلی کی وہ کسی انقلاب سے کم نہ تھا۔لیکن انہوں نے اپنی فارسی شاعری کے مقابلے میں اردو شاعری کو کمتر قرار دیا۔ہر چند کہ انہوں نے باضابطہ حمد نہیں کہی لیکن ان کے دیوان کی پہلی غزل کا پہلا شعر نازبندگی کی بہترین مثال ہے:۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

(غالبؔ)

اسی طرح جرأت جیسا بدنام زمانہ ریختی کا شاعر بھی حمد کہے بغیر نہ رہ سکا:

گر کبھے ارادہ تری قدرت کے رقم کا　　تو پہلے ہی سر سجدے میں جھک جائے قلم کا

(جرأت)

نظیر اکبرآبادی اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے مشترکہ ہندوستانی تہذیب کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا اور ہندوستانی رسم و رواج، میلے ٹھیلے اور عوامی بول چال کی بھاشا کو اپنا کر ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی اور غزل کے بجائے نظم میں طبع آزمائی کی۔چنانچہ ان کے ہم عصر شعراء نے انہیں بھانڈ کہنے سے بھی گریز نہیں کیا لیکن وہ بھی مشترکہ ہندوستانی یا قومی تہذیب کے تحت حمد کہے بغیر نہ رہ سکے:

الٰہی تو فیاض ہے اور کریم　　الٰہی تو غفار ہے اور رحیم

مقدس، معلیٰ ، منزّہ عظیم　　ہے تیرا شریک اور نہ تیرا سہیم

تری ذات والا ہے یکتا قدیم

(نظیر اکبرآبادی)

مشترکہ قومی تہذیب کے تحت صرف مسلمانوں ہی نے نہیں بلکہ ہندو شعرائے کرام نے بھی گل و بوٹے کھلائے ہیں۔فراق، موزوں، دیا شنکر نسیم، باوا کرشن کوپال مغموم، دیپک قمر وغیرہ کے یہاں بھی مشترکہ تہذیب کی نمائندگی ملتی ہے:

میں سمجھا بلال اب اذاں دے رہا ہے کیا جھک کے سجدہ
جو جمنا کنارے اڑانے لگا تان ہنسی بجیا

(دیپک قمر)

مسجد کا نہ مندر کا پرستار ہوں میں　　اخلاص و اخوت کا علم دار ہوں میں
ملحد ہوں کہ مشرک ہوں خدا ہی جانے　　انساں ہوں انسان کا غم خوار ہوں میں

(باوا کرشن گوپال مغموم)

اردو کے دشمن بھی اس بات کو ماننے کے لئے مجبور ہیں کہ اردو خالص ہندوستانی زبان ہے۔مغلوں نے جو مشترکہ قومی تہذیب کا بیج بویا تھا اور جس نے آگے چل کر تناور درخت کی شکل اختیار کرلیا، اردو اسی کی دین ہے، اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی، پلی، بڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے چار دانگ عالم میں پھیل گئی۔اس کی ترویج و اشاعت میں ہندوستان کی تمام قوموں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔بقول ڈاکٹر تاراچند:۔

''مسلم ذہن ہندوانہ رنگ روپ قبول کرنے لگا اور اس نے فارسی و ترکی کی جگہ مقامی زبانوں کو سیکھا اور استعمال کرنا شروع کیا۔ہندوؤں نے عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کو مقامی محاوروں میں جگہ دی۔اس لین دین کا منافع ہماری تہذیب کے خزانے میں اردو زبان کی شکل میں شامل ہوا۔''(ہندوستانی کلچر کا ارتقاص:۴۸)

اردو زبان پر بعض متعصب اور فرقہ پرست افراد یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے سب کچھ عربی اور فارسی سے اخذ کیا ہے لہٰذا یہ ایک باہری زبان ہے اسے بہتان تراشی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر کامل قریشی کہتے ہیں کہ:۔

''مولانا سید احمد دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ کے بیان کے مطابق اردو کے ذخیرۂ الفاظ کی تعداد ساڑھے پانچ لاکھ سے متجاوز ہے اور ان میں تقریباً تین چوتھائی الفاظ کی تعداد سنسکرت الاصل ہے۔اس کے زیادہ تر حرفوں، ضمیروں، فعلوں، مصدروں، سابقوں، لاحقوں اور اعداد و شمار کی تعداد ہندی الاصل ہے۔صرف ایک چوتھائی الفاظ اس نے

عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، پرتگالی اور دوسری زبانوں سے لئے ہیں۔ چونکہ ترکوں، عربوں، ایرانیوں اور مغلوں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ بہت سی چیزیں بھی آئیں اس لئے اس کے اسماء صفات وغیرہ کا عربی و فارسی ہونا قدرتی امر ہے۔'' (اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، ص: ۱۷)

تاریخ شاہد ہے کہ جن زبانوں میں جذب وانجذاب کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے وہ نہ تو عوامی زبان بن سکتی ہے اور نہ ہی وقت کے ساتھ آگے بڑھ سکتی ہے اور پھر ایک نہ ایک دن دم توڑ دیتی ہے اور تاریخ کا حصہ بن جاتی ہے۔ اردو کی خوبی یہ ہے کہ اس کے دامن میں جو کچھ بھی آیا اس نے اسے قبول کرلیا اور خود کو مالا مال کرلیا۔ ہندوستان کی مٹی میں اردو کی جڑیں اتنی گہرائی تک پیوست ہیں کہ اس کا اکھاڑ پھینکنا ناممکن ہے۔ بقول خواجہ احمد فاروقی:۔

''اردو نے فارسی سے استفادہ کیا ہے لیکن اس کی رگوں میں ہندوستانی خون ہے اس کا ادب ہندوستانی تہذیب کی رنگا رنگ فضا میں پروان چڑھا ہے۔ اس کے مشاعرے بعض اوزان وبحور، اس کی سراپا نگاری، اس کی بیانیہ نظمیں، اس کے بارہ ماسے، اس میں محبت کی لفظیات، بیان فراق بابرہ ورمن، اس کی بعض صوفی اصطلاحیں، بعض اقدار و وظائف، ذوق وشوق کے کلمات، پیا اور ساجن، رسم ورواج، وضع قطع، لباس وآرائش، گھر کی فضا، غرض اس کی زمین، اس کا آسمان یکسر ہندی الاصل ہیں۔'' (اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، ص: ۱۸)

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ نظیر اکبرآبادی نے نہ صرف یہ کہ مشترکہ ہندوستانی تہذیب کو وسیلۂ اظہار بنایا بلکہ خود کو اس تہذیب کے سانچے میں پوری طرح ڈھال لیا تھا۔ ان کی نظموں کے عنوانات اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ اس تہذیب کی آخری منزل تک پہنچ گئے تھے۔ نظیر کی نظموں کے عنوانات ملاحظہ ہوں جن سے اس کی وسیع المشربی اور سیکولر مزاجی کا اندازہ لگانا بیحد آسان ہوگا۔

تمدن عنوان کے تحت نظموں کے عنوانات اس طرح ہیں: ''عرس حضرت سلیم چشتی، شب برات،

عید، عیدالفطر، عیدگاہ اکبرآباد، بسنت، ہولی پر دس نظمیں، سامان دیوالی کا، راکھی۔''

میلے عنوان کے تحت:۔ ''آگرہ کی تیراکی، بلدیو جی کا میلا، کنکوے اور پتنگ''

کھیل تماشے عنوان کے تحت:۔ ''کبوتر بازی، بلبلوں کی لڑائی، گلہری کا بچہ، ریچھ کا بچہ، ازدہا کا بچہ۔''

مختلف فصلیں اور ان کے لوازم کے تحت:۔ ''بہار، چاندنی، جھڑی، برسات اور پھسلن، برسات کا تماشا، برسات کی بہاریں، اومس، اندھیری، کورا برتن، آگرے کی ککڑی، تربوز، آندھی، جاڑے کی بہاریں، تل کے لڈو۔''

حکمت عنوان کے تحت:۔ ''کوڑی، پیسا، روپیہ، زر، مفلسی، افلاس کا نقشا، آٹے دال کا بھاؤ، روٹیاں چپاتی، دعائے تندرستی، شکر تندرستی، خوشامد، اہل دنیا اور آدمی نامہ''

حکایات عنوان کے تحت:۔ ''قصہ ہنس، پودے اور گڑھ پنکھ کی لڑائی، کوئے اور ہرن کی دوستی، قصہ لیلیٰ مجنوں۔''

کلیات نظیر کا دوسرا حصہ تیرہ نظموں پر مشتمل ہے اور یہ سبھی نظمیں ہندو صنمیات سے متعلق ہیں۔ مثلاً جنم کنہیا جی کا، بالپن بانسری بجیا کا، بانسری، کھیل کود کنہیا جی کا، بیاہ کنہیا کا، وسم کتھا، ہر کی تعریف، سیکشن ونسی مہتا، درگا جی کے درشن، تعریف بھیروں کی، توکل یا ترک طمع، کنہیا جی کی راس، مہادیو کا بیاہ''۔

مذکورہ فہرست پر نظر ڈالئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ نظیر نے شخصیات میں سب سے زیادہ نظمیں کنہیا جی پر اور تمدن کے تحت دس نظمیں ہولی پر لکھی ہیں۔ اور ایک نظم نانک پر لکھی ہے۔ میں چاہوں گا کہ ان نظموں سے مثالیں پیش کردوں تا کہ نظیر کی لفظیات اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب اور تخلیقی مزاج سے واقفیت ہو سکے:۔

ہیں کہتے نانک شاہ جنہیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو
وہ کامل رہبر جگ میں ہیں ہوں درشن جیسے شاہ گرو
مقصود مرا امید سبھی بر لاتے ہیں دل خواہ گرو
نت لطف و کرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرباہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو

سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

(نانک شاہ گرو)

جب پھول کا سرسوں کے ہوا کے آگے کھلتا
اور عیش کی نظروں سے نگاہوں کا لڑ بھتا
ہم نے بھی دل اپنے کے تئیں کر کے نچنتا
اور ہنس کے کہا یار سے 'اے لکڑ بھوتا'
'سب کی تو بسنتیں ہیں یہ یاروں کا بسنتا'

(بسنت)

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
ساغر مے کے چھلکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں جھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

(ہولی)

چلی آتی ہے اب تو ہر کہیں بازار کی راکھی
سنہری، سبز، ریشم زرد اور گلفام کی راکھی
بنی ہے گو کہ نادر خوب ہر سردار کی راکھی
سلونوں میں عجب رنگیں ہے اس دلدار کی راکھی
نہ پہنچے ایک گل کو یار جس گلزار کی راکھی

(راکھی)

جب ساعت پرگٹ ہونے کی واں آئی مکٹ دھریا کی

اب آگے بات جنم کی ہے جے بولو کشن کنہیا کی

(جنم کنہیا جی)

ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن کیا کیا کہوں میں کشن کنہیا کا بالپن

(بالپن بانسری بجیا کا)

جب مرلی دھر نے مرلی کو اپنی اُدھر دھری کیا کیا پریم میت بھری اس میں دُھن بھری

لی اس میں رادھے رادھے کی ہردم بھری کھری لہرائی دُھن جو اسکی ادھر اور ادھر زری

سب سننے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری

ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

(بانسری)

ہے روپ کشن جی کا جو دیکھو بہت انوپ اوران کے ساتھ چمکے ہے سب گوپیوں کا روپ

مہتابیاں چھٹیں ہیں گویا کھل رہی ہے دھوپ اس روشنی میں دیکھ کے وہ روپ اور سروپ

ہر آن گوپیوں کا یہی مکھ بلاس ہے

دیکھو بہاریں آج کنہیا کی راس ہے

(کنہیا جی کی راس)

ان نظموں کے علاوہ آدمی نامہ، بنجارہ نامہ، ہنس نامہ اور دوسری بہت سی نظموں میں بھی ہندوستانی تہذیب کی عکاسی ملتی ہے۔ بقول وزیر آغا:۔

"اردو نظم میں نظیر کی سب سے بڑی عطا یہ ہے کہ اس نے شعر کو آسمان سے اترنے اور زمین کی باس سونگھنے کی طرف متوجہ کیا اور یوں اپنے وطن کی دھرتی اور اس کے اشیا ہی کو نہیں بلکہ اس کی روایات، تلمیحات اور ثقافتی مظاہر سے بھی گہری وابستگی کا ثبوت بہم پہنچایا۔" (اردو شاعری کا مزاج، ص:۳۹۴)

نظیر اکبر آبادی کے علاوہ اور بہت سے شعرائے کرام ایسے ہیں جن کی نظموں میں ہندوستانی تہذیب

وتمدن کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے مثلاً میر انیس کے مرثیوں میں گرچہ واقعات کربلا کا ذکر ہے لیکن واقعہ نگاری میں ہندوستان کی جھلک موجود ہے۔ صالحہ عابد حسین نے بالکل صحیح کہا ہے کہ ''انیس کے یہاں کربلا کے مرد مجاہدوں میں ہندوستانی رنگ نسبتاً ہلکا ہے اور خواتین میں یہ رنگ گاڑھے اور شوخ ہیں''۔ (اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، ص: ۱۱۷)

ان کے علاوہ اکبر، حالی، اسماعیل میرٹھی، شاد، چکبست، تلوک چند محروم، صفی لکھنوی، اقبال، جوش، اختر شیرانی، شاد عارفی، مظہر امام، راج نرائن راز، کمار پاشی، کرشن موہن، عادل منصوری وغیرہ کے یہاں بھی مشترکہ ہندوستانی تہذیب کی جھلکیاں موجود ہیں۔

محسن کاکوروی کا نعتیہ قصیدہ بھی ہندوستانی تہذیب سے معمور ہے۔ اس پورے قصیدہ میں سب سے زیادہ شہرت ومقبولیت اس تشبیب والے حصہ کو ملی جس میں ہندوستانی تہذیب کی فضا آفرینی کی گئی ہے:

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل　　برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل　　جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے ایک طویل عمل
کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی　　ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل
ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے　　نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل

علامہ اقبال کی شاعری بھی ہندوستانی تہذیب وثقافت کی آبیاری کرتی نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں شخصی، مذہبی اور حب الوطنی کی مثالیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ چند نظموں کے عنوانات یہاں درج کئے جارہے ہیں مثلاً ''ہمالہ، کوہسار، ترانہ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، شوالہ، سوامی رام تیرتھ، ترانہ ملی، رام، نانک وغیرہ۔ اقبال کی مذکورہ نظموں کے چند اشعار پیش خدمت ہیں جن سے اقبال کے تخلیقی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا　　ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا　　وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
اے آب رود گنگا وہ دن ہیں یاد تجھکو　　اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا

(ترانہ ہندی)

یا پھر نیا شوالہ کا ایک ایک شعر ایک محبِّ وطن کے مزاج کا آئینہ دار ہے:

سچ کہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے سارے پجاریوں کو مئے پیت کی پلادیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

(نیا شوالہ)

وزیر آغا نے گیت، غزل اور نظم کو ہی اردو اصناف سخن کی بنیاد مانا ہے۔ بقیہ صنفیں ان تینوں اصناف سخن کی ذیلی شاخیں ہیں۔ انہوں نے ان اصناف کے مزاج کو مختلف انداز سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

"گیت مزاجاً نسوانیت کے غنائی اظہار کی ایک صورت ہے۔ ثقافتی لحاظ سے اس کا نہایت گہرا تعلق زمین سے ہے اور زمین عورت سے مشابہ ہے، گیت عورت کے جذبۂ آزادی کی پیداوار ہے۔ یہ اس وقت جنم لیتا ہے جب زمین سے چمٹی ہوئی عورت شعور ذات کی پہلی کروٹ سے آشنا ہوتی ہے اور تمام بندھنوں کو توڑ کر اپنے پیتم پتی تک پہنچنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے لیکن تیاگ کا یہ عمل منفی انداز کا حامل نہیں ہے، گیت محبت میں مبتلا ایک عورت کے دل کی پکار ہے، گیت وہ جذبہ ہے جو جسم کے نغماتی زیر بم پر رقص کرتا ہے، یہ جذبہ محبوب کے لمس سے بیدار ہوتا ہے لیکن اپنے اندرونی تحرک کی مدد سے سبک بار اور لطیف ہو کر جسم کو بھی لحظہ بھر کے لیے لطیف اور سبک بار بنا دیتا ہے۔ یوں کہ جذبے کی معیت میں جسم بھی گاتا اور رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی لئے گیت میں جذبے کو نغمے اور رقص کی سنگت حاصل ہوئی ہے۔" (اردو شاعری کا مزاج،

ص:۱۸۵۔۱۹۰)

گیت ،غزل اور نظم بظاہر تین اصناف سخن ہیں اور تینوں کا مزاج بھی الگ الگ ہے لیکن داخلی سطح پر تینوں ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں۔وزیر آغا کے لفظوں میں:

''گیت اس وقت جنم لیتا ہے جب عورت کا دل محبت کے بیج کو قبول کر لیتا ہے۔دوسری طرف غزل اس بیج کے بار ور ہونے اور ایک نئے پیکر کے وجود میں آنے کی داستان کو پیش کرتی ہے تاہم غزل اس نومولود کو بحیثیت ایک کل پیش نہیں کرتی۔یہ کام نظم کا ہے''۔

(اردو شاعری کا مزاج،ص:۲۳۵)

بہر کیف! گیت ہو یا غزل،نظم ہو یا دوسری اصناف سخن اس کی عمارت تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی بنیاد پر کھڑی ہے،ادبیات عالم کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قومی،تہذیبی اور اخلاقی و ثقافتی ادب ہی انسانی ادب کہلاتا ہے۔قومی ادب وتہذیب سے زندگی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔چنانچہ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اردو زبان وادب کی رگوں میں نہ صرف یہ کہ مشترکہ ہندوستانی تہذیب بلکہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کا خون دوڑ رہا ہے اور اسی سے اردو کے تخلیقی مزاج کی آبیاری ہوئی ہے۔اور برصغیر ہندو پاک میں اخلاقی اقدار کے فروغ میں اگر کسی زبان کی سب سے زیادہ حصہ داری رہی ہے تو وہ اردو زبان ہے۔

ماخذ:۔

۱۔اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب	مرتبہ:	ڈاکٹر کامل قریشی
۲۔ترقی پسند ادب۔پچاس سالہ سفر	مرتبہ:	قمر رئیس،عاشور کاظمی
۳۔اردو شاعری کا مزاج	از:	وزیر آغا
۴۔قومی تہذیب کا مسئلہ	از:	سید عابد حسین

۵۔اسلامی تہذیب اوراس کے اصول ومبادی	از:	سید ابوالاعلیٰ مودودی
۶۔کلیات نظیر	مرتبہ:	سلیم جعفر
۷۔کلیات اقبال	از:	علامہ اقبال

جمہوریت کی اخلاقیات اور ادب

ڈاکٹر محمود شیخ

جمہوری نظام سیاست، آزادی اور مساوات کے مادیاتی تصورات پر استوار ہے۔ جو اپنی کامیابی کے اظہار میں 'جدیدیت' کو حکم بنا کر پیش کرتی ہے۔ چونکہ سرمایہ داری ایک فلسفیانہ مفروضہ ہے۔ جس نے اپنے تحفظ میں جمہوریت کو پیدا کیا، لہٰذا جمہوریت اور اس کے پیدا کردہ نظریات فکر و فن بھی فلسفیانہ مفروضات پر مبنی ہیں۔ فلسفہ انسان اور اشیا کی مادی خصوصیات سے وابستگی رکھتا ہے۔ جذبات و احساسات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اس لیے فلسفہ کی اخلاقیات بھی نہیں ہوتی۔ وہ صرف مادیاتی توازن و عمل کا ترجمان ہوتا ہے۔

جب فن و فلسفہ اور سائنس و ٹکنالوجی کا وجود نہ تھا۔ اس وقت بھی ماں کی شفقت و محبت کا یقین اپنا وجود رکھتا تھا۔ جس نے معاشرتی تشکیل میں اپنے فرائض مادریت کی کبھی فراموش نہیں کیا۔ تہذیب و تمدن، حیات و معاشرت کا محور روز اول سے ماں ہی رہی ہے۔ تہذیبیں مٹ گئیں، مذاہب فراموش کر دیے گئے مگر ماں کا وجود اپنی صداقت اور یقین کے ساتھ آج بھی روشن ہے۔ فن و فلسفہ نے خود کو ثابت کرنے کے لیے انگنت روپ بدلے مگر ماں کی شخصیت و کردار کے سامنے اسے بھی سرنگوں ہونا پڑا۔ حالانکہ نقلی ماں (Surrogate Mother) اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی (Test Tube Baby) معاہدہ کی شادی (Contract Marriage)، Live in Relationship اور Sex Worker نظریات کے ذریعہ سائنس و ٹکنالوجی، سیاست و معیشت نے اپنی برتری کا دعویٰ تو ضرور پیش کیا ہے۔ لیکن ماں کا جذباتی وجود آفتاب و ماہتاب کی طرح روشن و تابناک ہے۔ جذبۂ عشق و محبت کی طہارت و پاکیزگی کا آخری نشان بھی وہی ہے۔

رشتوں کی تخلیق میں ماں کا وجود کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ مرد رشتوں کی ترویج میں معاون تو ہو سکتا ہے۔ مگر جذبۂ تخلیق ماں کے وجود کا ایک لازمی حصہ ہے۔ جیسے گندم کا ایک دانہ خاک میں مل کر گل گلزار ہوتا

ہے۔عشق ومحبت کے جذبات انسان سے انسان کی جذباتی وابستگی کی علامت ہیں۔خاندان اور معاشرہ کی تعمیر میں جذباتی رشتہ داریاں ہی کام آتی ہیں۔نظم معاشرت ہموار ہوتا ہے۔لوگوں میں ہمدردی اور موانست کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔رشتۂ انسانیت کے ذریعہ قومیں ایک دوسرے کے نزدیک آتی ہیں۔مختلف الخیال اور اجنبی افراد ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں۔اگر جذبۂ مادریت ختم ہو جائے تو خاندان اور معاشرہ کا جذباتی وجود اور جذبۂ انسانیت کا شعور بھی فنا ہو جائے گا۔جب ماں ہی نہ رہے گی تو درس اخلاق ومحبت سے عاری خاندان اور معاشرہ کیوں کر برقرار رہ سکتے ہیں؟تہذیب وثقافت کا وجود چونکہ اقدار حیات سے وابستہ ہے۔اس لیے ماں کے خاتمہ کے ساتھ اس کا ختم ہونا بھی یقینی ہے۔مہذب دنیا مرد وزن سے آباد نہیں بلکہ اس کا وجود ماں کے جذباتی رشتہ پر بار ہے۔اس حقیقت پر یقین کیے بغیر کوئی شخص ایک اچھا انسان اور فنکار نہیں ہو سکتا۔

رشتوں کی حفاظت تعزیرات اخلاق کے ذریعہ دو طرح سے مستحکم کی گئی ہے۔ایک وہ جس نے معاشرتی زندگی کو داخلی سطح پر منظم کیا ہے۔جس پر مرد وزن کے تعلقات نفسی اور جذباتی رشتے استوار ہوتے ہیں۔نفسی رشتوں کا جنسی تصور میاں بیوی کے درمیان نسل آدم کے فروغ میں معاون ہوتا ہے۔جذباتی تعلقات اپنے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔خالہ، چچی، پھوپی، ممانی حالانکہ ماں نہیں ہوتیں۔مگر قدر اخلاق کے رو سے ان کا درجہ والدہ سے کم بھی نہیں ہوتا۔دادی، نانی سے بچوں کی جذباتی وابستگی بعض گھروں میں والدین سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔یہی خواتین عائلی نظم خاندان کو کنٹرول بھی کرتی ہیں۔جس سے محبت وخلوص، عفو ودرگزر، احترام آدمیت کے جذبات کو فروغ ملتا ہے۔'نقلی ماں' اور 'معاہدہ کی شادی' کے جدید تصورات سے مذکورہ رشتوں کی اہمیت، توقیر وتجسیم ختم ہو جاتی ہے۔جس سے معاشرہ میں انتشار وخلفشار پھیلتا ہے اور انسان مادہ پرست ذہنیت کا اسیر ہو جاتا ہے۔دوسری صورت میں قدر اخلاق کے تحفظ کے لیے قانون کا سہارا لیا جاتا ہے۔چوری، قتل وغارتگری، رشوت ستانی ودیگر سبھی جرائم عالم انسانیت نے ناپسندیدہ قرار دیے ہیں اور ان پر سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں تاکہ خاندان اور معاشرہ کو فتنہ وفساد سے محفوظ رکھا جا سکے۔حق وراثت کا قضیہ بھی قانونی دفعات کے مقرر کردہ ضابطوں کے مطابق سلجھایا جاتا ہے۔جس سے معاشرہ میں نظم عدل وانصاف قائم

ہوتا ہے۔لیکن جب قانون،قدر اخلاق پر حاوی ہونے کی کوشش کرتا ہے تو بیانیہ صدق وصفا متزلزل ہوجاتا ہے اور انارکیت پھیلتی ہے۔

سائنس جس طرح ایٹم (Atom) کو توڑنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔اور اپنے میکانکی نفسیاتی شعور وعمل کی مدد سے سیاست ومعاشرت،تجارت ومعیشت پر قبضہ کیا اور ان کی قوت وطاقت کے ذریعہ فطرت ومعاشرت کی عائلی قدروں سے متصادم ہے۔مثلاً سیاسی نظام معیشت نے مرد وزن کو مساوی حقوق دے کر انہیں کل کارخانوں کا ایندھن بنادیا۔جس سے پیداواری معاملات میں تیزی آتی ہے۔اشتہارات میں خواتین کے جسمانی خطوط کی دل آویزی سے خریداروں کو متاثر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔سرمایہ دار دولت کے حصول میں عورت کو ایک مشینی پرزہ کی طرح استعمال کرتا ہے۔وہ اس کے لیے جنسی تسکین کا سامان بھی بہم پہنچاتی ہے۔جس سے اخلاقی قدریں ٹوٹتی ہیں۔سیاسی آزادی اور مساوات کا تصور ہر اس ضابطۂ اخلاق کو متروک قرار دیتا ہے جس سے سرمایہ داری کے مجوزہ نظام کو ٹھیس لگتی ہے۔ملکوں ملکوں،شہر شہر،ملازمت پیشہ افراد کے لیے شادی یا نکاح ایک بندھن ہوسکتا ہے۔لہٰذا ان کی دل بستگی کے لیے Sex Worker کی خدمات قیمت دے کر خریدی جاسکتی ہیں۔Contract Marriage اور Living in Relationship کے تصورات عورت کے تعمیری،تہذیبی اور ثقافتی رشتوں پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔جس سے ماں کا تصور ہی فوت ہوجاتا ہے۔اس ایک رشتہ کے ختم ہوتے ہی دیگر تمام رشتوں کی تقدیس بھی تمام ہوجاتی ہے، اور ایک ایسا معاشرہ جنم لیتا ہے جس میں بچے والدین کی شفقت ومحبت سے محروم ہوتے ہیں۔خصوصاً G8 ملکوں میں رشتوں کا المیہ واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔جہاں اڑتیس فیصد سے زیادہ بچے رفاہی اداروں کے رحم وکرم پر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔اخلاقی ضابطے،تجارت اور سیاست کے راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں،جنہیں آزادی اور مساوات کے سیاسی حقوق کے ذریعہ ختم کرنے کی جسارت کی جاتی ہے۔پہلی اور دوسری جنگ عظیم کا سانحہ بھی غیر اخلاقی طرز سیاست نے پیدا کیا تھا۔اس بار انہوں نے فن وفلسفہ کے سیاسی شعور کے ذریعہ اقدار حیات کی انسانی قدروں کو اپنا ہدف بنایا ہے۔جس سے تمام دنیا میں خصوصاً G8 ملکوں میں اخلاقی جرائم کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ایک رپورٹ کے مطابق:

''دنیا کی ہر تیسری اور جنوبی ایشیا کی ہر دوسری عورت آج تشدد کا شکار ہے۔امریکہ میں ہر چھ منٹ بعد ایک عورت زیادتی کا نشانہ بنتی ہے۔یورپ میں چودہ سال سے چوالیس سال تک کی خواتین کا اپاہج پن یا وفات کی وجہ گھریلو تشدد ہے۔جنوبی ایشیا میں ساٹھ فیصد سے زیادہ عورتیں گھریلو تشدد کا شکار ہیں اور اسی خطے سے سالانہ ڈیڑھ لاکھ لڑکیاں اسمگل کی جاتی ہیں۔دنیا میں سالانہ پانچ سے پندرہ سال تک کی بیس لاکھ لڑکیوں کو جنسی کاروبار کے لیے اسمگل کیا جاتا ہے''۔(اردو دنیا، دسمبر ۲۰۱۲ء۔صفحہ ۶۰)

جب انسانی رشتوں پر زوال آتا ہے تو فطری معاشرہ بھی قائم نہیں رہتا۔دوسری جنگ عظیم کے بعد تعمیریت کے نام پر تمام مغربی معاشرہ پر سرمایہ داری پوری طرح قابض ہوگئی۔اس نے نوآبادیاتی نظام کو تمدنی، تہذیبی اور ثقافتی سطح پر فروغ دینے کے لیے سیاسی معیشت اور سیاسی عسکریت کو ایک نفسیاتی حربہ کی طرح استعمال کیا تھا۔اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اسے مشرقی ملکوں کی اخلاقی قدروں کو نشانہ بنانا ضروری تھا۔لہذا اقدار اخلاق کے سامنے مادیاتی شعور وعمل کی مضبوط دیوار کھڑی کر دی گئی جسے عبور کرنا آسان نہ تھا۔انسان نے دیکھا کہ کردار کی بلندی، عصمت و پاکیزگی، دولت وشہرت، آرام و آسائش کی ضامن نہیں ہوسکتی۔لہذا اس نے سرمایہ دارانہ نظام کے عطا کردہ نظریات فکر وفن کو قبول کرنے میں عجلت سے کام لیا تھا۔عوامی کردار کمزور ہوا تو عدل و انصاف اور خیر وشر کی تشریحات پر بھی زوال آگیا۔ثقافتی استعماریت کا مقابلہ تاویلات عقلی کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔کمزور اور مفلوک الحال افراد کے پیش کردہ دلائل سیاسی اور معاشی طور پر مستحکم افراد کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔نظام عدل و انصاف پر بھی انہی کا قبضہ ہے۔ایسی صورت میں اخلاقی عظمت و رفعت کا تصور بے معنی ہو جاتا ہے۔

صبر وقناعت، عفو ودرگذر، رحم وہمدردی، ضبط وتحمل، عصمت وعفت، عشق ومحبت اعلیٰ انسانی اوصاف ہیں۔سرمایہ دارانہ نظام سیاست ومعیشت میں مذکورہ جذبات انسانی کا کوئی گزر نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ دولت وشہرت واقتدار کی کشش انسان کو ظالم اور متکبر بنا دیتی ہے۔آزادی اور مساوات کا سیاسی تصور اخلاقی زندگی کو مزید بہتر بنا سکتا ہے۔لیکن ایک بے کردار اور نفس گزیدہ انسان اپنی ضرورت وخواہش سے مغلوب ہو کر ہی

آزادی اور مساوات کا استعمال کرتا ہے۔ جب انسانی کردار ہی درست نہ ہو تو فلاح انسانیت کا کوئی تصور کیسے فروغ حاصل کر سکتا ہے؟ جمہوری نظم سیاست میں ایسا کوئی ضابطۂ اخلاق بھی متعین نہیں کہ جو حیات انسانی کو مثبت و مستحکم خطوط پر استوار کر سکے۔ ہر شخص آزادی اور مساوات کے مادی تصورات سے فیض اٹھانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی ضمیر اور معاشرتی قدریں مفادات نفسی کے آگے بے بس ہو گئی ہیں۔

تغیر ایک ناگزیر سچائی ہے اس لیے انسانی مزاج و کردار کی طرح معاشرتی قدریں بھی تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ مگر انسانی رشتوں کا تقدس روز اول سے قائم و دائم ہے۔ جنہیں مادیاتی نقد و نظر کی غیر اخلاقی تاویلات کے ذریعہ منتشر کیا جاتا ہے۔ جو لوگ قدر انسانیت پر یقین رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ عشق و محبت، دوستی و رفاقت کی کوئی مادیاتی توجیہہ ممکن نہیں ہے۔ لہذا جذبات انسانی کو Complexes قرار دے کر ان پر نفسیاتی ملمع کاری کی جاتی ہے۔ تا کہ جذباتی اعمال پر مادیاتی شعور کی بالادستی قائم ہو سکے۔ مرد و زن کی محبت کا معیار جنسی اختلاط متصور کیا جاتا ہے۔ دوستی اور رفاقت کا رشتہ بھی وقت اور حالات کے تحت تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ پنڈت برج نارائن چکبست کا مندرجہ ذیل شعر آثار قدیمہ کی طرح شاندار ضرور ہے مگر اسے نفسیاتی کردار کی ضرورت کے بطور قبول نہیں کیا جا سکتا۔

؎ دردِ دل پاس وفا جذبۂ ایماں ہونا　　آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

کردار کا تعلق اخلاق سے ہے۔ اخلاق اگر ہے تو کردار بھی ہوگا۔ جمہوری نظام فلسفہ چونکہ ایک غیر اخلاقی نظریۂ سیاست ہے لہذا اس کے پروردہ افراد کا کردار بھی نہیں ہوتا۔ آزادی اور مساوات کے مادیاتی تصورات کے ذریعہ جمہوریت اپنے نظریات فکر و فن میں توازن عقلی پیدا کرتی ہے۔ کردار کی بلندی اور پستی سے اس کی کوئی وابستگی نہیں ہوتی۔ اس کی نظر میں اندھا اور آنکھ والا دونوں برابر ہیں۔ مساوات انسانی ایک عمدہ اخلاقی نظریہ ہے جسے وہ اپنی سیاسی تاویلات کے ذریعہ معاشی برابری کے حصول میں استعمال کرتی رہی ہے۔ تعلیمی مساوات کا مقصد بھی انسان کو معاشی طور پر خود کفیل بنانا ہے۔ جمہوری نظام سیاست و معیشت (Political Economy) میں خصوصیت (Quality) پر کم اور مقبولیت (Popularty) پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ یہ مفروضہ اشیا اور افراد دونوں پر عائد ہوتا ہے۔ مشرق میں مقبولیت کا معیار کردار کی مثبت

خصوصیات انسانی میں تلاش کیا جاتا ہے۔جمہوریت کردار کے منفی اور مثبت پہلوؤں پر کردار کی سیاسی اور معاشیاتی مقبولیت کو ترجیح دیتی ہے۔

''روسو کہتا ہے: ری پبلک کی صحیح بنیاد نیکی ہے۔جمہوری طرز کی کامیابی کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ تمام پبلک قابل اور تعلیم یافتہ ہو جائے۔چنانچہ اس سلسلے میں لکھتا ہے کہ :اگر دنیا میں دیوتاؤں کی قوم ہوتی تو اس کے لیے جمہوری طرز حکومت بہت مناسب ہوتی۔لیکن ہم انسانوں کے لیے ایسا مکمل نظام کچھ سازگار نہیں۔ دنیا میں نہ کوئی جمہوریت قائم ہوئی ہے نہ اب ہو سکے گی۔یہ قانون قدرت کے خلاف ہے کہ اکثریت حکمرانی کرے اور اقلیت محروم رہے۔دنیا میں کوئی طرز حکومت خانہ جنگیوں، سازشوں اور فرقہ بندیوں کا اتنا بڑا مرکز نہیں ہوتی جتنا کہ جمہوریت میں اس کے امکان موجود ہیں''۔(سید زبیر ایم اے۔نیرنگ خیال۔اقبال نمبر ١٩٣٢۔صفحہ ١٥٠)

مذکورہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ نیکی ہی ریاست کی بنیاد ہے۔لیکن سیاسی دنیا نفس پرست انسانوں سے آباد ہے۔ان میں اتحاد و اتفاق صرف اخلاقی تعلیمات کے ذریعہ ہی پیدا کیا جا سکتا ہے۔اخلاقی امور، حیات انسانی میں توازن و اعتدال پیدا کرتے ہیں، تاکہ خواہشات نفسی کے غیر اخلاقی جوش و عمل کو غلط راستوں پر جانے سے روکا جا سکے۔اس سلسلہ میں 'ناگارجن' کی سہر لیکھ، ترجمہ و نزول ١٨٨٦ء کے چند اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں۔اس کا ترجمہ تبتی ترجمہ سے ہوا ہے۔

١۔یہ معلوم ہے کہ دولت فانی اور عارضی ہے۔پس اخلاقی اصول یہ ہے کہ بھکشو، برہمن، غریب اور دوستوں پر صرف کرو۔خیرات سے بڑھ کر کوئی دوست نہیں ہے۔

٢۔اخلاق کو بے عیب، بے آمیزش، بے دروغ پر عظمت ظاہر کرو۔اس لیے کہ ساری عظمت و جلال کا انحصار اخلاق پر ہے۔جس طرح زمین متحرک اشیا کا سہارا ہے۔

٣۔خیرات، خلق، صبر، توانائی، مراقبہ، عقل کی ناقابل وزن اور اعلیٰ سے اعلیٰ نیکیوں کی عادت ڈالو۔اس لیے کہ جب تم سمندر حیات کے آخری کنارے پر پہنچو تو لوگوں میں

مقبول ہو۔

۴۔ خاندان، شکل وصورت، عظمت، شباب اور طاقت سے متعلق حرص، فریب، منافقت، شہوت، غرور، لالچ، نفرت، تکبر کو اپنا دشمن سمجھو۔

۵۔ چونکہ کوئی شے صبر سے زیادہ دشوار حصول نہیں ہے۔ پس غصہ مت کرو۔ بدھ نے کہا ہے: جو غصہ ترک کرتا ہے وہ رشی کا درجہ حاصل کرتا ہے اور آواگون کی تکلیف برداشت نہیں کرتا۔

۶۔ اگر تمہارے کپڑوں یا سر کو آگ لگ جائے تو اس وقت بھی خواہش کی فنا کی کوشش کرو۔ اس سے بڑھ کر کوئی اہم ضرورت نہیں ہے کہ خواہش کو فنا کیا جائے۔

۷۔ اخلاق، علم، دھیان سے پرسکون نروان کی بلا آلائش عظمت حاصل کرو۔ جو سن و شعور، موت یا فنا کے تحت نہیں ہے۔

اردو زبان کا دامن ادب عشق ومحبت، دوستی اور خیر سگالی کے جذبات سے لبریز ہے۔ حالانکہ غزلیہ شاعری میں شیخ و برہمن کے کردار کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ لیکن کسی کے شخصی اور مذہبی وقار کو کبھی مجروح نہیں کیا گیا۔ حضرت امیر خسرو کی مثنویات میں وطن دوستی کے عناصر فکر اس قدر واضح ہیں کہ ان کی وسیع المشربی پر ہر کس و ناکس کو ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔ صوفیائے کرام اور علما عظام کی سینکڑوں تصانیف لائبریریوں کی زینت ہیں لیکن کسی کتاب میں ایسا کوئی جملہ نہیں لکھا گیا جس سے عوام الناس کی دل آزاری ہوتی ہے۔ عبدالرحیم خان خاناں، ملک محمد جائسی حالانکہ اردو زبان وادب کے شاعر نہیں تھے لیکن ان کے تبحر علمی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مغل بادشاہوں کی سوانح، ان کی ڈائریاں بھی ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں بھی کہیں کسی راجہ، مہاراجہ کی تشنیع وتحقیر نہیں کی گئی ہے۔ فاتح اور مفتوح کے بیان میں بھی مسلم تاریخ دانوں نے نہایت وسعت نظری کا مظاہرہ کیا ہے۔ داستانوں اور مثنویات میں بھی جذبۂ الفت ومحبت کا بیان سرفہرست ہے۔ مگر دیگر زبانوں کی ادبیات میں وسیع المشربی کا فقدان صاف نظر آتا ہے۔ مسلم بادشاہوں کی تکذیب اور ان کے کردار کو ننگ انسانیت ثابت کرنا ہی غیر مسلم دانشوروں کا مشغلہ رہا ہے۔ قلی قطب شاہ، بہادر شاہ ظفر اور نواب واجد علی شاہ

صاحب دیوان شاعر اور فراخ دل حکمراں تھے مگر ان کی شخصیت میں ایسے منفی پہلو تلاش کیے جاتے ہیں، جن سے اخلاقی شخصیت کا وقار مجروح ہوتا ہے۔

اردو زبان و ادب کی شعری اور نثری لفظیات کا ایک بڑا حصہ انسان دوست خیالات کا ترجمان ہے۔ جذبات و احساسات کے بیان میں ایسی اصطلاحات کثیر تعداد میں موجود ہیں جو انسانی زندگی کے نازک ترین احساسات کو اپنی گرفت میں لے کر قارئین کو مسحور کر سکتی ہیں۔ اردو کو اپنی ابتدا سے صوفیائے کرام کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ اس لیے فقر و غنا، بے ثباتی دنیا، صلح و آشتی، توکلت الی اللہ اور اعلیٰ انسانی اوصاف کے مضامین بھی کثرت سے شامل بیان رہے ہیں۔ جنت، جہنم، نور، طور، کلیم، عشق، محبت، خلوت، جلوت، فرقت، فراق، حباب، ہستی، نقاب، وفا، صدا، ندا، آئینہ، آتش، حجاب، محشر، ساقی، محفل، جام، مینا، دیوانہ، فرزانہ، تقدیر، تدبیر، آرزو، تمنا، زنجیر، محبوب، رقیب، حبیب اور یقین جیسی لفظیات کے علاوہ ذوق و شوق، جن و انساں، ہجر و وصال، ماہ و انجم، صنم و حرم، کون و مکاں، مہر و ماہ، جام و سبو، پیچ و خم، ساز حیات، درد دل، چشم شوق و دیگر اصطلاحیں صالح فطرت ذہن کی ترجمان ہیں۔ جس کا مقصد فکر کائنات اور انسان کے جذباتی رشتوں کی تجدید و استواری ہے۔ یہ وہ انسان ہے جو خدا کی بنائی کائنات اور تصور عبودیت پر یقین رکھتا ہے۔ اس کا منتہائے نقد و نظر تخریب نہیں تعمیر ہے۔ اسے نفس امارہ کی خودغرض اور مفاد پرست ذہنیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ دولت و شہرت و اقتدار کی طلب نے اس کے وجود کو منتشر بھی نہیں کیا ہے۔ اس میں جذبۂ عشق و محبت کی صداقت کا احساس بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس لیے اس کا اخلاقی وجود بھی برقرار ہے اور وہ انسانی فکر و فہم بھی جس پر انسانیت کا مدار ہے۔ میرؔ، سوداؔ، دردؔ، آتشؔ، ناسخؔ، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ کی شاعری میں صوفیانہ عناصر فکر کی فراوانی انسان دوست خیالات کی ترجمان ہے۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و تمدن اور قومی اتحاد و اتفاق کے خوبصورت نمونے بھی نظیرؔ اکبرآبادی کے کلام کا اہم وصف ہیں۔

مشرقی تہذیب و تمدن کی بنیاد ی اکائی اجتماعیت ہے۔ شیخ محی الدین ابن العربی کا نظریہ 'وحدۃ الوجود' کی مقبولیت کی اہم وجہ بھی یہی ہے۔ مگر فلسفیانہ نظریات فکر و فن اختلاف نقد و نظر سے تحریک لیتے ہیں۔ اردو ادب چونکہ اتحاد و اتفاق کا ترجمان ہے لہٰذا فلسفۂ تنقید کا مغربی تصور قابل قبول نہیں ہو سکا۔ لوگوں میں انتشار و

خلفشار کو ہوا دینا سیاسی طرز عمل کی ضرورت ہے۔ جس نے تمام دنیا کو مختلف قومیتوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ با اقتدار و با اختیار قومیں خود کو برتر ثابت کرنے کے لیے ایسے افکار و نظریات کو فروغ دیتی ہیں جن سے ان کی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ فلسفۂ سیاست و معیشت و سائنس تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کو عالم انسانیت کے لیے غیر ضروری قرار دے کر ان پر محاسبہ قائم کرتا ہے۔ اخلاقی اصول و ضابطے انسانی کردار اور معاشرہ کو منضبط کرتے ہیں۔ مگر پیداواری معاملات میں مددگار ثابت نہیں ہوتے۔ ان میں نفس امارہ کے مادیاتی شعور کا فقدان ہوتا ہے۔ سائنٹفک ایجادات و اختراعات اور سائنٹفک سوسائٹی کے قیام میں بھی نظریۂ اخلاق انسان کی تجرباتی قوتوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس کا کوئی میکانکی نظم عمل بھی نہیں ہوتا۔ عقل صالح انسانی جذبات و احساسات کے فلاحی تصورات کے تابع ہوتی ہے۔ جمہوری نظم سیاست نے فلسفیانہ شعور و ادراک کو استحکام دے کر عقل کی اختراعی قوت و عمل کو وسعت دی ہے۔ جس نے تمام دنیا کو ایک ایسا نظم حیات عطا کیا جس سے تمام دنیا ایک گاؤں کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ فاصلے سمٹ گئے اور دریا پایاب ہو گئے ہیں۔ پیداواری معاملات میں بھی قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ انسان دوست مشینیں زندگی کے عام مسائل کے حل میں لوگوں کا ساتھ دیتی ہیں۔ حکومتیں عوامی حقوق کے تحفظ میں قانون بناتی ہیں۔ مگر جب انسانی وجود عقل کی مرتب کردہ میکانکی زندگی کا اسیر ہو جاتا ہے تو اس کی جذباتی شخصیت کے اخلاقی تصورات پر زوال آتا ہے۔ علامہ اقبالؔ مغربی سیاست کی اس روش کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔

؎ ہے دل کی موت مشینوں کی حکومت!　　احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات!

ارسطو حالانکہ فطرت کے تخلیقی عمل سے ناواقف ہے مگر کائنات کے میکانکی عمل کا قائل بھی نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے:

> کائنات کا کوئی بھی عمل مقصد کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ تمام کائنات ترقی کی راہ پر خوب سے خوب تر کی جستجو میں گامزن ہے۔ اس کی ہر شے ممکنہ حد تک خوبصورت ہے۔ کوئی شے بیکار نہیں، سب کا مقصد متعین ہے یہاں تک کہ ایک عمدہ خاتون خانہ کی طرح وہ اپنے کوڑے کا مصرف بھی نکال لیتی ہے۔ اس کا نظم عمل میکانکی نہیں مخصوص و معین

ہے۔(E Zeller, Out Line of the History of Greek
(Philosophy. P170

جمہوری نظم سیاست کے زیر سایہ علوم فلسفہ نے اتنی ترقی کی ہے کہ انسانی ذہن پر مادیاتی تفکرات حاوی ہو گئے ہیں۔ لوگ آسودہ حال زندگی کے لیے معاش و معیشت کا حصول ضروری خیال کرتے ہیں۔ خواہشات نفسانی نے جائز و ناجائز، حق و باطل کی تفریق بھی ختم کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جرائم کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا ہے۔ لوگ جرم کرتے ہیں مگر شرمندہ نہیں ہوتے۔ خواتین پر ہو رہے مظالم سے بھی دنیا واقف ہے۔ مگر اس کا کوئی حل اسے نظر نہیں آتا۔ وجہ صرف ایک ہے سرمایہ دارانہ طرز سیاست خواہشات نفسی کو فروغ دیتی ہے تا کہ سرمایہ کی اہمیت و افادیت برقرار رہ سکے۔ ضمیر انسانی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ انسان کے دل سے اگر دنیا کی محبت نکل جائے تو کاروبار زندگی کا مادیاتی شعور بھی معطل ہو جائے گا، اور سائنسی ایجادات و انکشافات کی رفتار بھی دھیمی پڑ جائے گی۔ "آنند مٹھ، شیطانک ورسیز اور کتنے پاکستان"؟ جیسے ناول حالانکہ عصبیت قلب و نظر کے ترجمان ہیں مگر ان کا مقصد تحریر غیر اخلاقی تصورات ادب کی راہ ہموار کرنا بھی ہے۔

عدل و انصاف اور خیر و شر کا معیار سیاسی قانون اور سیاسی افراد کی اکثریت ہی طے کرتی ہے۔ ان میں وہ میڈیائی دانشور بھی شامل ہیں جنہیں سیاسی اور ذاتی مفادات عزیز ہوتے ہیں۔ وہ کسی تحقیقی سچائی کے قائل نہیں ہوتے۔ مثلاً ٹیپو سلطان اور اورنگ زیب کے متعلق جو نظریہ فرقہ پرستوں نے قائم کیا تھا، اسے جدید تحقیقات نے غلط ثابت کر دیا ہے۔ اس کے باوجود اسکول، کالج کی کتابوں میں غیر مصدقہ لٹریچر ہی پڑھایا جاتا ہے۔ سرسید اور اقبال خواہ کتنے ہی محبِّ قوم و وطن کیوں نہ ہوں، سیاسیات اور سماجیات کے نصاب میں انہیں ایک مخصوص ذہنیت کے ساتھ پیش کیے جانے کا رجحان عام ہے۔ مقننہ، منتظمہ، عدلیہ اور میڈیا نظام جمہوریت کے متعین کردہ چاروں ادارے سیاسی پیچ و خم میں اپنا وجود تلاش کرتے ہیں۔ خود کو مہذب ثابت کرنے کے لیے صرف انگریزی زبان و ادب کی واقفیت ہی کافی ہے حالانکہ کوئی غیر ملکی زبان ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی ترجمان نہیں ہو سکتی۔ مگر سیاسی ذہن اس حقیقت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اردو زبان و ادب کو

نظر انداز کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر اسے علمی معاملات میں فروغ دیا جاتا ہے تو انگریزی و دیگر زبانوں کا تعمیر کردہ سیاسی اور تہذیبی ڈھانچہ منتشر ہو جائے گا اور مفاد پرست افراد کو اپنا نظریۂ علم و فن از سر نو مرتب کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد سے اردو زبان و ادب کو نصابیت سے دور رکھنے کی کوشش کی جارہی ہے، تا کہ زبان و ادب کے تعمیری اور اخلاقی حقائق سے نظام سیاست و معیشت کے غیر اخلاقی تفکرات ادب کو محفوظ رکھا جا سکے۔

شعر و ادب و تاریخ ہی نہیں صالح اقدار حیات کا ایک عمدہ نمونہ اردو صحافت بھی ہے۔ جس کی شہادت تارا ایس نائر کے مضمون میں اس طرح پیش کی گئی ہے۔

> جب بابری مسجد، رام جنم بھومی تنازعہ اپنے عروج پر تھا۔ کئی ہندی اخباروں نے اپنا سرکولیشن بڑھانے کی غرض سے ہندو قوم پرستی کے نام پر جی بھر کے زہر اگلا۔ 1992-93 کے ممبئی فسادات کے دوران یہی کام 'سامنا' اور 'ترون بھارت' جیسے مراٹھی اخباروں نے کیا۔ مارچ 2002 کے گجرات قتل عام کے دوران 'گجرات سماچار' اور 'سندیش' وغیرہ نے ہندوؤں اور ہندو مندروں پر فرضی حملوں کے بارے میں جو قطعاً من گھڑت اور بے بنیاد کہانیاں شائع کیں، ان کے نتیجے میں قتل و غارت گری کے واقعات میں کافی اضافہ ہوا۔ گزشتہ پندرہ برسوں میں پریس کونسل آف انڈیا ایسے کئی اخباروں کو سنسر کر چکی ہے۔ ہماری بہترین اطلاعات کے مطابق کسی بھی اردو اخبار کو ایسا کوئی نوٹس نہیں ملا۔ (Tara S. Nair, Economic & Political Weekly, 27 Sep 2003)

موسیقی، مصوری، سنگ تراشی اور ادب سب پر سیاست وقت کے اثرات نمایاں ہیں۔ بہت معمولی معمولی افراد شہرت حاصل کر کے فنکار اور دانشور کی صف میں آجاتے ہیں۔ ان کا مقصد حیات دولت و شہرت کے حصول تک محدود رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج فن و ادب کی تمام صورتوں پر زوال آگیا ہے۔ فنکار اپنی روداد نفس کہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نے اجتماعیت کا حق ادا کر دیا۔ حقیقت پسندی کا لازمی نتیجہ فنی رشتوں کی

تنزلی کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔خصوصاً قدر اخلاق کو دیکھنے والی آنکھیں آہن پوش ہوئیں۔جنسی اور مادیاتی تفکرات کی آمیزش سے آج جس ادب کی تخلیق کی جارہی ہے۔اس کی بنیاد فنکار کے انفرادیت پسند سرمایہ دارانہ شعور پر استوار ہے۔لہذا اخلاقی شعورادب سے عاری تخالیق قاری کے ذہن و دل پر اپنا کوئی دیرپا تاثر چھوڑنے میں ناکام رہی ہیں۔

❁❁❁❁❁

خواتین افسانہ نگار اور اخلاقی اقدار

ڈاکٹر کہکشاں پروین
صدر شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی

زندگی سے اخلاق قدروں کا رشتہ ازلی ہے جب یہ دنیا قائم کی گئی اور انسان کو یہاں بھیجا گیا تو یقیناً یہ عمل اخلاقی قدروں کی تشکیل کا پہلا زینہ تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو نافرمانی کی سزا کی صورت میں زمین پر بھیج دیا گیا ہوسکتا ہے کہ خالق باری نے انسان کو اخلاقی قدروں کا سبق دینے کے لئے اس سرزمین کا انتخاب کیا۔ یہ زمین ایک درس گاہ ہے جہاں علم اور قدروں کا حصول صرف نظریاتی طور پر نہیں ہوتا۔ دنیا میں پیغمبروں ،صوفیوں کی ہستیاں اخلاقی اصولوں کو عام کرنے اور انسان کو ان کا پابند بنانے کے لئے سامنے آتی گئیں۔ اور یہ قدریں پوری عالم انسانیت کو ایک مرکز پر لانے میں کوشاں ہیں ازل سے اور شاید ابد تک۔

کہا جاتا ہے ادب زندگی کا آئینہ ہے اور اس آئینہ کی ضرورت سماج کی نمود کے ساتھ ہونے لگی سماج کی تشکیل بھی اس اخلاقی اقدار کی تلاش کا ایک راستہ ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو ادب زندگی کو پیش کرتا ہو وہ انسانی قدروں سے ناشناسا ہو۔ ادب اور زندگی کا ساتھ اٹوٹ ہے لہٰذا زندگی کے بہترین اصول وہی ہوتے ہیں جن میں اخلاقی پہلو موجود ہوں۔ اخلاق کیا ہے قدریں کیا ہیں اور بہترین اصول کیا ہیں یہ الگ بحث ہے پھر بھی میری نظروں میں اخلاق کے لوازمات میں مساوات، ہم آہنگی، انصاف ایمان اور توازن کا ہونا ناگزیر ہے۔ ذہن اور ماحول کی سازگاری کے لئے اس سماجی شعور کا ہونا لازم ہے کہ کون سی چیز ہمارے لئے ہماری نسل کے لئے اور ہماری قوم کے لئے مفید ہے۔ جہالت، پسماندگی اور بے توقیری کی فضا میں پنپتی ہوئی شخصیتیں اپنی ذات سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔ ایسی صورت حال کو صحت مند نہیں کہا جاسکتا۔ سرکشی اور بغاوت کے اصولوں کو دور رکھ کر صحیح معنوں میں انسان اخلاقی اصولوں کو دھیان میں رکھے تو خود بخود بہت سے ایسے کام انجام پائیں گے جو اس پوری کائنات کی فلاح کے لئے ہوں گے۔ انسانی سماج ایسا جہاں جنگل راج نہ ہو جہاں جبر دباؤ اور نفرت نہ ہو جہاں ہر آدمی بلاتفریق سر اٹھا کر جی سکے۔ مساوات ان معنوں میں کہ دوسرا

خود کو کمتر نہ محسوس کرے کشادگی ان معنوں میں کہ دوسرے کو گھٹن نہ ہو، حصولیابی ان معنوں میں کہ دوسرا استحصال کا شکار نہ ہو، انصاف ان معنوں میں کہ ایک انسان دوسرے سے خوف زدہ نہ ہو اس طرح اخلاقی قدریں حیوانیت اور طاقت و جبر کے مظاہرے کو پابند کرتی ہیں۔ فرد کے ذہن کی آبیاری میں ان قدروں کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ انسانی زندگی میں تعمیر و تخریب کے پہلو شب و روز کی طرح اٹل ہوتے ہیں۔ اسی میں تعمیری قدروں کی پروان زندگی کو اعلیٰ اخلاقی قدروں سے وابستگی عطا کرتی ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ کیونکہ اس کے پاس ذہن بھی ہے اور زبان بھی یہ ذہن اسے ایک ڈھانچہ بننے سے روکتا ہے اور یہ زبان اس سے اخلاقی سبق سکھانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ جمود کو توڑنا اخلاقی اقدار کا فریضہ ہے ذہن پر طاری جمود و سکوت کی چادر کو چاک نہ کیا جائے تو اسے نہ صرف ذہن کی قوتیں شل ہو جاتی ہیں بلکہ جسمانی اعضاء پر بھی اثر پڑتا ہے ذہن کی ہدایت کے بغیر تمام حرکات و سکنات عجب اول جلول شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ ذات کی تلاش اخلاق کے بغیر نہیں کی جا سکتی طرز رہائش اور انداز گفتگو اور آداب زندگی کو کسی حد تک تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اخلاقی قدروں کو بدلا نہیں جا سکتا یہ قدریں نہ صرف زندگی میں توازن برقرار رکھنے میں مددگار ہیں بلکہ زندگی کے تناؤ اور کشمکش کو دور کرنے میں بھی معاون ہوتی ہیں، فلسفہ حیات کوئی بھی ہو ذات اور معاشرہ سے الگ نہیں ہو سکتا اور معاشرہ کا وجود میں آنا ایک قسم کی اخلاقی تعلیم ہے۔ نئے نئے تجربوں میں اگر اقدار حیات کی تلاش کی جائے تو بلاشبہ انسان کی نجات ممکن ہو سکے گی، زندگی سے فرار کی بجائے ایک نیا حوصلہ اور نئی خوشی و مسرت کی حصولیابی ہوگی کیونکہ احساس گناہ، بے عملی اور بے زاری کی فضا کو اخلاقی دائرے ہی چاک کر سکتے ہیں۔ اس اخلاقی دائرہ کی وسعت کا ایک بڑا ذریعہ ادب ہے۔ ادب نے ہمیشہ زندگی کی آئینہ داری کی ہے اور مثبت پہلوؤں کی پاسبانی کی ہے۔ خواہ کوئی بھی صنف ہو لیکن قدروں کی پاسداری اس کا امتیاز رہا ہے۔ خاص طور سے ناول اور افسانہ نے اخلاقی تعلیم کو بہت فروغ دیا۔ ۱۹۶۰ کے بعد اردو افسانے میں جدیدیت کے رجحان کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر افسانہ نگاروں کی جو نئی پود سامنے آئی اس نے زندگی کے ان مسائل کو اپنا موضوع بنایا جو خارجی تھا۔ ان لوگوں نے خارجی پہلوؤں پر نگاہ رکھی اور بقیہ تمام چیزوں کو نظر انداز کیا اس طرح فرد کی مادی ضروریات کی تکمیل کا راستہ تو نظر آیا لیکن ذہنی ارتقاء میں کوئی خاص

فرق نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تحریک زندگی کے اہم مسائل وضروریات کو منظر نامے پر لانے میں کامیاب ہوئی لیکن داخلی احساسات اور اسی قدروں کی محافظت میں ناکام رہی جو اشیاء کی کمی وزیادتی سے انسانی زندگی میں تخریبی پہلوؤں کی نفی کرتی ہیں۔ اس تحریک کے زیر اثر جو طوفان برپا ہوا اور جس قسم کی ذہنی تبدیلیاں رونما ہوئیں ان سے اردو کی خواتین افسانہ نگار بہت حد تک محفوظ ہیں دیکھا جائے تو خواتین افسانہ نگاروں نے اعلیٰ اقدار اور آدرشوں کو ایک خاص انداز سے آراستہ کیا ہے اور زندگی کو صحیح معنوں میں فعال بنایا ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں حب الوطنی، جانبازی اور سرفروشی کے جذبات قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ یگانگت کو اہمیت دی ہے۔ آزادی کا صحیح مفہوم، اپنی تہذیبی میراث اور روایات کا احترام برقرار رکھا ہے۔ عشق ومحبت اور حقیقت نگاری کی پیش کش کے نام پر ادب میں طرح طرح کی گمراہیاں لائی گئیں جس سے پاکیزگی اور لطافت کا حصہ معدوم ہونے لگا لیکن انسانی کرداروں کو نکھارنا اور سماجی رشتوں کو ایک نیا رنگ دینا خواتین افسانہ نگاروں کی خصوصیت رہی ان کے یہاں دوسروں کے دکھ درد کو سمجھنے اور زندگی میں ایک توازن اور نرمی کو قائم رکھنے کا بھرپور جذبہ ملتا ہے۔ انسان کے اندر اچھے جذبات کو فروغ دیا جائے تو نہ صرف اس کی اپنی شخصیت میں نکھار آتا ہے بلکہ اپنے سماج میں بھی وہ ایک سلیقہ پیدا کرنے کا کامیاب آلہ کار ثابت ہوسکتا ہے۔ ادب پر ماحول کا خاص اثر پڑتا ہے۔ انسانی ذہن اور خیالات کا ٹکراؤ دراصل سماج کے مختلف رجحانات کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے اور ان کی وجہ سے تبدیلیاں وجود میں آتی ہیں کہیں یہ تبدیلی منفی ہوتی ہے کہیں مثبت۔ خواتین افسانہ نگاروں نے دوسروں کی سیرتیں تعمیر کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اپنی کمزوریوں پر قابو پانا اور ضبط واعتدال سے کام لینے کی ترغیب ان کے افسانوں میں ملتی ہے۔ عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں میں جس مسلم گھرانوں کی تصویر کشی کی ہے اور لڑکیوں کے ناپختہ ذہنوں پر پڑنے والے خارجی وداخلی اثرات کو نمایاں کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے گرچہ ان کی تحریروں پر فحاشی کا الزام لگا ہے وہ بدنام بھی بہت ہوئی ہیں لیکن یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ ان کے افسانوں نے اخلاقی اقدار کو جگایا ہے ان خامیوں کی طرف دھیان دلایا ہے کہ جو اکثر غلط ماحول اور غلط حالات کے تحت انسان کے اندر پیدا ہوجاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک بچہ جب وجود میں آتا ہے تو وہ بالکل اچھوتا اور سادہ کاغذ کی طرح ہوتا ہے۔ یہ تو سماج اور معاشرہ پر انحصار کرتا ہے کہ اس سادہ کاغذ پر کس روشنائی سے تحریر

سجائے مذہب اور ماحول کا اثر اس پر پڑتا ہی رہتا ہے اور حالات کے تحت اس کی ذہنیت بدلتی ہے۔لیکن اس تبدیلی کے پس پردہ تعلیم کی اہمیت بھی اہم رول ادا کرتی ہے۔عصمت چغتائی نے کہیں بھی برائیوں کو پنپنے نہیں دیا ہے۔انہوں نے انہی برائیوں کو سامنے لایا ہے جو کسی بھی سماج اور کسی بھی مذہب کے انسان میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔افسانہ پڑھ کر پہلا تاثر یہی ابھرتا ہے کہ ایسا ہونا نہیں چاہئے صحیح اور غلط کا یہی امتیاز اخلاقی قدروں کا امین ہے اچھی قدروں کے لئے جگہ اور ماحول کا بھی صاف ستھرا ہونا لازم ہے کیونکہ کہانی تو ہماری فضا کے آس پاس ہی گذرتی رہتی ہے عصمت کے یہاں کرداروں کے جو اہم تجزیے ہیں،ان میں لذت کی بجائے ان کے منفی رویے کی عکاسی کے ساتھ ساتھ زندگی کے گھناؤنے پہلوؤں کی نمایاں تصاویر ہیں ان کا مشہور بدنام زمانہ افسانہ ''لحاف'' پڑھ کر کسی کو اگر شرم یا کراہیت کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنی دیانت داری میں کامیاب ہیں کیونکہ وہ لذت کی بجائے ایسے احساسات کو سامنے لانا چاہتی ہیں جو غلط حالات اور ماحول کی دین ہوتے ہیں۔ذرائع جب بدلتے ہیں تو انسانی سوچ بھی وہی رخ اختیار کرنے لگتی ہے عصمت چغتائی نے اپنی سوچوں کو ایک نیا آسمان دیا،انہوں نے نہ معاشیات کا فلسفہ پڑھا اور نہ اپنی ذات کے خول میں مقید ہوئیں تبدیلی زمانے کا مقدر ہے لیکن کچھ قدریں اپنی جگہ ثابت وسالم رہتی ہیں اور یہی وہ کسوٹی ہے جہاں انسانی ذہن کو پرکھا جاتا ہے۔

جیلانی بانو نے جس وقت لکھنا شروع کیا وہ مارکسی تحریک کا دور تھا۔گرچہ انہوں نے اس تحریک کا بھر پور ساتھ نہیں دیا لیکن زمانے کے اثرات سے ان کا ذہن بے نیاز بھی نہیں رہا۔خاص طور سے مسلم خواتین کن کن چیزوں کی شکار ہوتی ہیں یہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔اس لئے باغیانہ لب ولہجہ بھی در آیا ہے۔ان کے یہاں ماضی کی مشترکہ تہذیب اور کلچر کا بھی گہرا اثر ہے۔انہوں نے انسانی زندگی کی بہتری کی صورتیں تلاش کی ہے۔اور انہیں پیش بھی کیا ہے۔معاشی،اقتصادی،تہذیبی زبوں حالی سے جس طرح بیکاری،فاقہ کشی اور مسلم لڑکیوں کی شادی بیاہ کے مسائل پیدا ہوتے ہیں ان سب کی نمائندگی ان کے یہاں ملتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب کی بہتریں جھلکیاں بھی ملتی ہیں ظاہر ہے کہ کوئی بھی تہذیب اخلاقی قدروں کے بغیر اپنا سفر طئے نہیں کرسکتی اور مشترکہ تہذیب تو صرف اخلاق اور انسانیت کی بنیاد پر ہی تعمیر ہوتی

ہے۔ان کے یہاں خود بخود مسائل اور قدروں کی واضح جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔موم کی مریم، چراغ، نئی عورت، یہ سب کہانیاں متوسط طبقے کے مسائل کو سامنے لاتی ہیں ان مسائل کو حل کرنے کے لئے جس جدوجہد اور کاوشوں کی ضرورت تھی ان میں سماجی تہذیبی اور اخلاقی اصول کارفرما تھے۔

قرۃ العین حیدر کے اسلوب پر رومانیت کی گہری چھاپ ہے۔انہوں نے جس طبقہ کو اپنا موضوع بنایا وہ ایک خاص طبقہ تھا لیکن اس خاص طبقہ میں بھی اعلیٰ قدروں کی پاسداری نظر آتی ہے۔قرۃ العین حیدر نے اپنے رومانی اور دل آویز اسلوب کے سہارے آزادی کے بعد ہندوستان کی بڑی اچھی عکاسی کی ہے۔

انہوں نے فسادات کے بعد مسلمانوں کا شیرازہ بکھرتے ہوئے دیکھا تھا عورتوں کے ساتھ ظلم و بربریت کے واقعات کو دیکھا اور ان تمام پہلوؤں پر اچھے افسانے لکھے کیونکہ ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھانا اور ایک اچھے سماج کی آرزو کرنا بھی اسی پہلو کی طرف اشارہ ہے جہاں اخلاقیات کے فلسفے ہوں یہ اخلاق ہی ہے جو ہر انسان کو سماج کا ایک اہم حصہ سمجھتا ہے اور مساوات پر زور دیتا ہے۔مسائل کا تعلق صرف مادی ضرورتوں سے نہیں ہوتا لالچ ہوس، خودغرضی، عیاشی یہ تمام عناصر بھی سماج میں انتشار پیدا کرتے ہیں اور ان عناصر کا بنیادی ضروریات کی تکمیل سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا بلکہ فرد کے ذہن اور ماحول کی وجہ سے بھی بہت ساری برائیاں پیدا ہوتی ہیں، تمام اخلاقی برائیوں کا یہ حل نہیں ہے کہ کسی خاص فرد یا طبقہ کو موردالزام ٹھہرایا جائے یا عورتوں سے متعلق جو مسائل ہوں ان کو حل کرنے کے لئے عورتوں کو پردے میں ڈالا جائے۔یہ ممکن نہیں ہے۔جتنی بھی خواتین افسانہ نگاروں نے اپنے قلم اٹھائے ہیں ان کے احساسات و تجربات مختلف ہوتے ہوئے بھی اخلاقی تصور پر ایک پلیٹ فارم پر یکجا ہیں۔ کچھ برائیاں سماجی اور معاشی وجوہات سے نہیں پیدا ہوتیں بلکہ اس کا تعلق انسان کی اپنی سوچ سے ہوتا ہے۔خواہشوں کا پیدا ہونا فطری عمل ہے۔لیکن اس کے حصول کے لئے غلط راہوں کا انتخاب اخلاقی دائرے سے باہر ہے۔اخلاقی قدریں انسان کو پابند کرتی ہیں۔مساوات و انصاف اور دنیا میں سبھوں کو جینے دینے کے لئے ان اصولوں کو لازم سمجھا گیا ہے۔

دراصل یہ قدر انسان کو ایک انسان بن کر جینا سکھاتی ہے۔ادب کے بدلتے ہوئے منظرنامے میں

حقیقت نگاری کا مفہوم بھی تبدیل ہوتا رہا ہے۔ زندگی کے تجربات جیسے جیسے بدلے مشاہدے بھی تبدیل ہوتے گئے۔ اطراف میں بکھرے ہوئے مسائل بھی نئے چہرے اپناتے گئے، عدل ونظریات کے پیمانے بھی بدلے اور افسانے کی ہیت اور اسلوب میں بھی بدلاؤ آتا گیا خواتین افسانہ نگاروں نے حقیقت کے مفہوم سے انحراف نہیں کیا لیکن ان لوگوں نے اخلاقی قدروں کی کبھی نفی نہیں کی یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ تجربے ارمشاہدے مختلف ہوتے ہوئے بھی اخلاقی تصورات کو توڑنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ کچھ تصورات اور کچھ قدریں ایسی ہوتی ہیں جو تغیر اور رفتار سے اگر متاثر ہونے لگیں تو انسانی سماج وتہذیب کا شیرازہ بکھرنے لگے گا۔

خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں شدت پسندی کی کمی رہی ہے کیونکہ انہوں نے سماج اور ماحول کی عکاسی کے ساتھ ساتھ قدروں کو بھی شامل رکھا ہے۔ اس لئے اکثر خواتین کے یہاں موضوعات محدود ہوگئے ہیں لیکن ایک بات مشترک ہے کہ ان کے یہاں سماجی بے اعتدالی پر بھرپور توجہ دی گئی ہے ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے رجحان سے کسی قدر الگ تھلگ رہ کر بیانیہ انداز میں مسائل اور اصولوں کی پیش کش اور تصادم میں بھی اخلاقی درس کو نمایاں رکھنا ان کا وصف رہا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ انسانی قدروں کا ساتھ دیا جو مذہب ،سماج اور قوم سے اوپر ہوتی ہیں۔ اخلاق کے خانے بھی مختلف انداز میں شمار کئے جاتے ہیں کہیں کہیں اس کے اصول زندگی کی شناخت الگ الگ انداز سے کرنے پر زور دیتے ہیں لیکن بہر حال ایک اٹل حقیقت ہے کہ اخلاق کا وہ تصور جو انسانیت پر مبنی ہوتا ہے وہ ہر سماج، ہر مذہب اور ہر دور میں یکساں رہا ہے۔

اردو میں خواتین افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے اپنے اپنے طور پر نہ صرف ادب کی خدمت کی بلکہ اپنی تہذیب اور معاشرہ کے ساتھ کچھ قدروں کی پاسبانی بھی کی۔ بچوں کی اولین درس گاہ کے طور پر انہوں نے اپنے فرائض کو بخوبی نبھایا اور اخلاقی پہلوؤں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ موضوعات کا سرزمین الگ ہوتے ہوئے بھی اخلاقی اقدار کے مینار کو منور رکھا کیونکہ اس منیار کی روشنی کی ضرورت ہر فرد کو ہے۔ صالحہ عابد حسین، عصمت چغتائی، جیلانی بانو، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، سرور جہاں، شکیلہ اختر، رضیہ سجاد ظہیر قمر جہاں، عفت موہانی، بانو سرتاج، صادقہ نواب سحر، ذکیہ مشہدی، شمیم صادقہ، انوری بیگم ان تمام خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں اخلاق کے روشن پہلو موجود ہیں۔:

''جوانی کے ان کے بھی کچھ تقاضے تھے لیکن اس معاملہ میں ان کے کچھ اصول تھے اور ان اصولوں کی حد کو انہوں نے کبھی نہیں پھلانگا۔''

''شبنم جیسی امی نے شعلہ برسائی آنکھوں سے بھائی کو دیکھا گالیاں منہ سے نکالنا شریفوں کا شیوہ نہیں ہے اور وہ تمہارے سگے پھوپھی زاد بھائی ہیں آگے نہ سنوں''

''ہمارے یہاں تو بزرگوں کو نعمت سمجھا جاتا تھا ان کی خدمت کی جاتی تھی مگر اب شاید بہت موڈرن ہو گئے ہیں کلچر ڈیہ صنعتی تہذیب لے ڈوبے گی ہمیں بھی۔''

''وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ قرآن میں لکھا ہے کہ دنیا بہت خوبصورت ہے۔اس میں خوشی سے رہو اور دوسروں کو بھی خوش رہنے دو۔''

''ناجئی نا ہائے اب دوسرے کے ہاتھ سے ان کر با کی پیسہ ماتو لیب اور لیوے دیب ہائے ہمر مالکنی تو ہمر مائی باپ تھے لا۔ای سوا کو روپیہ سے دن نا کٹ جاتی۔''

''پھٹے پرانے کپڑوں میں مفلوک الحال رکشا ڈرائیور اپنی سیٹ سے اتر کر ہینڈل کو پیچھے کی جانب گھما رہا تھا اس عمل میں اسے خاص تکلیف ہو رہی تھی اور وہ شرمندہ تھی کہ یہ اس کی ذرا سی لاپرواہی سے ہوئی ہے۔''

''اس نے سوچا یقیناً یہ آجکل کے غلط ٹی وی سریل کا اثر ہے، کتنے مہلک اثرات سے نئی نسل دوچار ہے کیا آج ہماری زندگی صرف تجارت ہو کر رہ گئی ہے۔''

اردو ناول میں اخلاقی قدریں

ڈاکٹر قمر جہاں

سابق ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز وصدر شعبۂ اردو بھاگلپور یونیورسٹی

محترم ومعزز حاضرین! سلام علیک

جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں کہ آج کے سمینار کا کلیدی موضوع ہے: ''اخلاقی قدروں کے فروغ میں اردو ادب کا حصہ''۔ برادر محترم پروفیسر احمد سجاد صاحب نے اس کا ذیلی عنوان ''اردو ناول میں اخلاقی قدریں'' پر خامہ فرسائی کے لیے مجھ ناچیز کو مدعو کیا ہے، لہٰذا طول طویل تمہید میں جانے کی بجائے اپنے اصل موضوع پر گفتگو کرنا پسند کروں گی۔

فکشن جسے لوگ دل بہلانے کا وسیلہ سمجھتے ہیں اور عام طور سے فرصت کے اوقات کو فکشن کے مطالعے میں صرف کر کے قلبی اور ذہنی سکون حاصل کرتے رہے ہیں لیکن فکشن دل بہلانے کے علاوہ بھی بہت کچھ اور ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ اردو میں ناول نویسی کی ابتدا ہی ملک کے اندر پھیلی ہوئی مختلف قسم کی اصلاحی تحریکات کا ثمرہ ہے، ہماری معاشرتی زندگی کے گوناگوں مسائل نے صنف ناول کی طرف ہمیں متوجہ کیا۔

اردو ناول میں اخلاقی اقدار کی تلاش وجستجو جب ہم کرتے ہیں تو اول اول ہماری نگاہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں پر پڑتی ہے۔ موصوف اردو ناول کے باوا آدم کہے جاتے ہیں، نذیر احمد کے تمام ناول کسی نہ کسی اخلاقی نکتے سے وابستہ ہیں۔ اردو کا پہلا ناول کہیے یا موصوف کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' ہے جس کا سنہ تصنیف 1869ء ہے اس ناول کی تحریر کا جواز ہی یہی ہے کہ مولوی نذیر احمد اپنی بچیوں کی تعلیم وتربیت سازی کے لیے قصے کے پیرایے میں دو سگی بہنوں کی کہانی بیان کرتے ہیں جو اپنے مزاج وکردار میں ایک دوسرے کی ضد ہیں، پہلے حصے میں اکبری کا قصہ ہے اور دوسرے میں اسکی چھوٹی بہن اصغری کی زندگی کے احوال ہیں۔ بڑی بہن نے اپنی خودسری، پھوہڑپن اور بدمزاجی سے اپنی شادی شدہ زندگی کو جہنم زار بنالیا ہے اور چھوٹی بہن

اصغری جو عمر میں اکبری سے چھوٹی تھی لیکن اپنی سمجھ بوجھ، اخلاقی بلندی اور علم دوستی وسلیقے سے اپنے گھر کو جنت کا نمونہ بنالیتی ہے۔ اپنی تمام گھریلو ذمہ داریوں سے نپٹنے کے بعد اس نے اپنا وقت فضول کوئی اور لڑائی جھگڑے کے بجائے تعلیم کی اشاعت میں صرف کیا۔ آس پاس اور دور دراز کی لڑکیاں اس کے مکتب میں داخل ہوتی ہیں اور اس طرح تعلیم نسواں کے فروغ میں وہ ممد و معاون ثابت ہوتی ہے اور اپنے اچھے اخلاق و کردار سے اپنے قاری کو متاثر کرتی ہے۔

ان کا دوسرا ناول ''بنات النعش'' جو 1873ء میں لکھا گیا ہے۔ پہلے ناول کی ہی توثیق ہے، اس میں انہوں نے جدید تعلیم کی افادیت کو محسوس کرایا ہے ساتھ ہی اپنے عہد کی تہذیبی اور اخلاقی کجروی کی نشاندہی کرتے ہوئے ان عیوب کو سماج سے دور کرنے کی سعی مستحسن دکھائی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار حسن آرا ہے جو ابتدا میں انتہائی بدتمیز اور بدمزاج نظر آتی ہے لیکن تعلیم کی روشنی سے منور ہونے کے بعد اس کے اندر سوئی ہوئی اخلاقی قدریں از خود روشن ہوگئی ہیں۔

''توبتہ النصوح'' مذہبی اصلاح پر مبنی ناول ہے۔ اس کا سنہ تصنیف 1877ء ہے، اس میں دو رائیں نہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد کا یہ ناول بقول اسلوب احمد انصاری:

''پہلا با قاعدہ ناول ہے جو اردو میں لکھا گیا ہے....''۔

اس ناول میں یوں تو کئی کردار ہیں لیکن تین کرداروں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، پہلا نصوح، دوسرا ان کا بیٹا کلیم اور تیسرا کلیم کا دوست ظاہر دار بیگ۔ زیر بحث ناول کے مطالعے کے بعد جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ ہے بچوں کی تعلیم و تربیت میں والدین کا رول اور ان کے اخلاق و کردار کی درستی کے لیے خود والدین کا مذہب کی طرف رجوع ہونا، نصوح کا خواب خود نصوح کے اخلاق و کردار پر ہی اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ پورے گھر کے ماحول کو ہی بدل دیتا ہے۔

گذشتہ ناولوں کے مقابلے میں یہاں اخلاقی اقدار کی ترویج و تشہیر زیادہ فنکارانہ انداز میں ہوئی ہے۔ غور کیا جائے تو نذیر احمد کی اخلاقیات کی بنیاد (Base) مذہب ہے۔ درج بالا ناولوں کے علاوہ ''فسانۂ مبتلا''، ''ابن الوقت''، ''رویائے صادقہ'' اور ''ایامیٰ'' کے مطالعے کے بعد ناقدین ادب کی رائے یہ ہے کہ:

''کوئی ایک ناول بھی ایسا نہیں ہے جس میں انیسویں صدی کی سماجی زندگی اور اس زمانے کے مسلمان گھرانوں کی حقیقت شعارانہ عکاسی نہیں کی گئی ہو، انہوں نے زندگی کے حقائق اور اس کے ٹھوس پہلوؤں کو ہمیشہ سامنے رکھا، کیونکہ ان کا مقصد انسان اور انسانی سماج کو بہتر بنانا تھا''۔(بیسویں صدی میں اردو ناول از پروفیسر یوسف سرمست۔ص 34-33)

ڈپٹی نذیر احمد کے علاوہ اس زمانے کے اہم ناولوں میں مولانا حالؔی کی ''مجالس النسا''(1874ء)، شادؔ عظیم آبادی کا ''صورۃ الخیال''(1876ء) جس کا ایک مشہور نام ''ولایتی کی آپ بیتی'' بھی ہے۔افضل الدین کا ''فسانۂ خورشیدی''(1886ء)، رشیدۃ النسا کا ''اصلاح النسا''(1894ء)، علی سجاد عظیم آبادی کا ''محل خانہ''(1903ء)، مولوی بشیر الدین احمد دہلوی کا ''اقبال دلہن''(1908ء)، سید احمد دہلوی کا ''قصہ مہر افروز''(1911ء) منشی ہادی حسین ہادی کا ''لاڈلی مٹی''(1912ء) وغیرہ ایسے ناول ہیں جن کا واضح مقصد خواتین میں علمی و اخلاقی بیداری ہے۔

عام طور سے یہ بات سننے میں آتی ہے کہ ادب کا خالص مقصدی یا اخلاقی ہونا، ادب کے سارے رس اور رنگ کو نچوڑ لینے کے مترادف ہے مگر اب اس کو کیا کہا جائے کہ خود زندگی بھی بغیر کسی مقصد و مدعا کے دیوانے کا خواب یا ایک مہمل حقیقت ہے، لہٰذا ادب بھی بلا واسطہ یا بالواسطہ کسی نہ کسی مقصد و مدعا سے ہی حسین ہے، اخلاقیات کی تو بنیاد ہی خیر و شر پر ٹکی ہوئی ہے۔The Novel Today کے مصنف کا خیال ہے کہ:

''.....تمام اچھے ناولوں کا مقصد انسان کو تبدیل کرنا اور انسان کے ذریعہ سماج کو تبدیل کرنا ہے...''۔(ص ۱۵)

قصہ مختصر یہ کہ ایک بہتر مہذب معاشرہ کی تخلیق میں فنکار کا ایک اہم رول ہے گو کہ اس بہتری کے متوازی برائیوں کی جلوہ گری بھی ہوتی ہے یا یہ کہا جائے کہ ہر تعمیر میں تخریب کے عناصر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں، برائیوں کی نقاب کشائی کے بغیر خوبیوں کی تلاش ممکن تو ہے مگر با اثر نہیں ہوتی کیونکہ ہر شے اپنی ضد سے اپنی پہچان بناتی ہے۔اردو کے ابتدائی ناولوں میں بھی ہمارے ناول نگاروں نے انتہائی سادگی کے ساتھ اپنے ارد

گرد کے ماحول و مناظر پر روشنی ڈالی ہے اور ایسی پستی و ایسی بلندی کا نظارہ پیش کیا ہے جو روز ازل سے ہی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔(ہمارا خیال ہے کہ ناول کی صنف فن سے زیادہ موضوع و مواد کی متقاضی ہے یعنی موضوع و مواد ہی صحیح معنی میں ناول کی اہمیت کا پیمانہ بنتے ہیں۔)

مولوی نذیر احمد ہوں یا راشد الخیری، شرر ہوں یا سرشار، شاد ہوں یا مرزا ہادی رسوا، کچھ آگے بڑھیے تو منشی پریم چند، علی عباس حسینی، سہیل عظیم آبادی، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، اختر اورینوی، صالحہ عابد حسین، خدیجہ مستور، سجاد ظہیر، قرۃ العین حیدر، رضیہ فصیح احمد، ممتاز مفتی، عزیز احمد وغیرہ۔غرض اردو ناول نگاروں نے ایک ایسا جہاں آباد کیا ہے جہاں چلتے پھرتے کردار اخلاقیات کے بنے بنائے فرسودہ سانچے میں شگاف پیدا کرتے نظر آتے ہیں اور ان کی جگہ ایک ایسی اخلاقیات کا تصور سامنے آتا ہے جو ان کے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔مثال کے لیے مرزا ہادی رسوا کے شریف زادہ یا امراؤ جان ادا کے متن کو دہرائیے۔امراؤ جان ادا جو ایک شریف زادی سے طوائف بن جانے پر مجبور کی جاتی ہے، اس کے ماضی میں جھانکئے تو بعض اخلاقی نکتے ازخود روشن ہو جاتے ہی دوستی اور دشمنی کی بھی حدیں ہونی چاہیے، عزت و ناموس کے پر تصنع اور خود ساختہ تصورات سے گریز کرنا چاہیے۔یہ تمام وہ کوششیں ہیں جن سے آگے چل کر جدید اردو ناول کا آغاز ہوتا ہے گویا خیر و شر تو ایک بنیادی نکتہ ہے اور اسی خیر و شر کے ٹکراؤ سے ہزاروں چنگاریاں پھوٹتی ہیں جنکی اساس اخلاقی قدروں پر ہے۔

عبدالحلیم شرر کے ''فردوس بریں'' کو پڑھیے، فرقہ باطنیہ کے فریب کردہ ماحول کا بھنڈا پھوٹنے کے بعد فردوس بریں کی بربادی اور شیخ علی وجودی اور ان کے ہمنواؤں کا عبرت ناک انجام کیا قاری کو کوئی اخلاقی درس نہیں دے رہا ہے؟

بدلتے ہوئے عہد اور مذاق و معیار کے ساتھ اخلاقی قدروں میں بھی نمایاں تبدیلیاں آئی ہیں، کیونکہ حق یہ ہے کہ اخلاقی اقدار بھی کوئی ٹھوس اور جامد شے نہیں، زمانے، ماحول اور مختلف ممالک کے سیاسی و سماجی حالات میں اس میں تغیر و تبدل بھی ہوتے رہے ہیں۔'کل' اور 'آج' کا فرق اسی حقیقت پر مبنی ہے۔'کل' اور 'آج' کے ناولوں میں بھی اخلاقی اقدار کے اعتبار سے بہت فرق آچکے ہیں۔بیسویں صدی اور اب اکیسویں

صدی میں ہم جن نئی ایجادات، نئے خیالات اور نئی اخلاقیات سے دوچار ہیں ان کا احاطہ کرنا آسان نہیں ہے، سائنسی ترقی نے اندر کے آدمی کو بہت بدل دیا ہے۔ بقول شخصے:

"مجموعی طور پر بیسویں صدی کے ناول میں زبردست تبدیلی تکنیک میں اتنی نہیں ہوئی جتنی اخلاقی اقدار پر نئے تصورات کے اثر سے ہوئی ہے"۔

حالانکہ اس قول کی سچائی آدھی ادھوری ہے، ہمارے خیال میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ بیسویں صدی میں اردو ناول تکنیک، مزاج اور اخلاقی و ادبی معیار غرض ہر اعتبار سے آگے کی چیز ہے۔ اب تو ہم اکیسویں صدی کے بھی بارہ سال گذار چکے ہیں، آج کا نیا انسان جس ذہنی اور اخلاقی صورت حال میں اسیر ہے، جدید ناولوں میں اسی نئے انسان کی اخلاقیات کو درشایا جارہا ہے۔ عہد حاضر میں لفظ "محبت" کی طرح "اخلاقیات" کا دائرہ بھی بے حد وسیع ہوگیا ہے، اس کی تعبیر و تشریح اتنی متنوع ہوگئی ہے کہ کبھی کبھی ہم حیران ہوجاتے ہیں کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟

English Literature of Twentieth Century کے مصنف اڈمنڈ ولن نے ایک جگہ لکھا ہے:

"..... یہ نظریۂ ارتقا کا نتیجہ ہے کہ انسان ہیرو کی بلند سطح سے گر کر بے بس جانور کی طرح بن گیا۔ پھر سے وہ کائنات میں ہیچ ہوکر اسکی مختلف قوتوں کے رحم و کرم پر ہوگیا....." (ص ۱۴۰)

آج کا انسان یا ہیرو شکست رنگ و رخ سے زیادہ اپنے اندر کے اخلاقی اور روحانی زوال سے ہراساں ہے۔ بقول کسی مصنف کہ:

"..... اب حقیقی لوگ اچھے ہوتے ہیں نہ برے، وہ ان دونوں کا ایسا سادہ آمیزہ بھی نہیں ہوتے جس میں نیکیوں اور بدیوں کے عناصر آسانی سے پہچانے جاسکیں۔..... انسان اب ان عناصر سے مل کر نہیں بنتے جسے صفات کہا جاسکے..... نفسیاتی علم بتاتا ہے کہ انسانی ہستی صفات کے مجموعہ سے زیادہ دریا سے

مشابہ ہے جو کبھی تیز بہتا ہے، کبھی آہستہ، کبھی صاف رہتا ہے کبھی گندہ.....وہ ہر لمحہ ایک مختلف سطح کو سامنے لاتا ہے.....'' (Guid to Modern Thought by Jude, Page 240)

عہد حاضر کے ناولوں میں بھی انسانیت اور اخلاقیات کی یہی مختلف سطحیں دیکھنے کو ملتی ہیں، اخلاقی سطح پر آج کے ہیرو یا ہیروئن ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے، وہ حالات کے رحم و کرم پر جینے کو مجبور ہیں اور اسی کے مطابق اپنے اخلاق و کردار کے انیک روپ دکھا رہے ہیں، بقول شاعر ؎

ہر اک چہرے کے پیچھے سینکڑوں کردار ملتے ہیں　　کسی بھی آدمی کا کوئی اک چہرہ نہیں ملتا

(لطف الرحمن)

اب میں چند جدید ناولوں کا تجزیہ کرنا چاہوں گی جن کی روشنی میں نئے عہد کے نئے انسان اور اخلاقیات کے بدلتے ہوئے تصور کا جائزہ ممکن ہو سکے گا۔ قرۃ العین حیدر اس عہد کی ایک نامور ناول نگار ہیں محترمہ کے ناول ''آگ کا دریا'' میں کوتم میلمبر، چمپا یا منصور کمال الدین کو دیکھئے۔ وقت اور حالات نے انہیں کیا سے کیا بنا دیا۔ اگلے جنم موہے بٹیا کیجیو، کی رشک قمر اور جمیل النسا کے کرداروں کی ایسی بلندی اور ایسی پستی کو ملاحظہ فرمائیے۔ اچاریہ شوکت خلیل کے ناول 'اگر تم لوٹ آتے' کے شریف احمد کا مطالعہ کیجئے اور مسز روز کے بارے میں ان کا یہ تاثرات ملاحظہ فرمائیے:

''.....شریف احمد خاں نے اپنی پوری کھلی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور پہلی بار محسوس کیا کہ ایک دل جو کسی دوست کے پاس ہوتا ہے وہی ایک دل کسی دشمن کے پاس بھی ہوتا ہے.....'' (صفحہ ۷) یعنی ''دل صرف دل ہوتا ہے اور وہ صرف محبت اور چاہت کا بھوکا ہوتا ہے.....''

یہ ایک ایسا اخلاقی نکتہ ہے جس میں صوفیت کی اصل روح پوشیدہ ہے، سکھ، شانتی اور امن کا پیغام ہے جس نے شریف احمد کو واقعی شریف احمد بنایا۔ 'اگر تم لوٹ آتے' کا اختتام بھی جس مکالمے پر ہوتا ہے، غور کیا جائے تو یہاں بھی وطن دوستی کا وہ اخلاقی درس ہے جو ہر وطن دوست کے دل کی آواز ہے، ملاحظہ فرمائیے:

"..... ویسے اگر تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ کیا کروں تو میں تو یہی کہوں گا کہ اچھا ہوتا اگر تم لوٹ آتے..... کیونکہ اپنے وطن کی بہت بری موت بھی ہمیشہ بہت اچھی ہوا کرتی ہے....." (ناول کا آخری صفحہ۔ص ۲۴۷)

عبدالصمد نے کل ملا کر چھ ناول اب تک پیش کیے ہیں (دوگز زمین ۱۹۸۸ء، مہاتما ۱۹۹۲ء، خوابوں کا سویرا ۱۹۹۴ء، مہا ساگر ۱۹۹۸ء، دھمک ۲۰۰۴ء اور بکھرے اوراق ۲۰۱۰ء) اس میں شک نہیں کہ ناول 'دوگز زمین' جس پر انہیں ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا، اس کے مقابلے میں بعد کے بعض ناول فنی نقطۂ نگاہ سے زیادہ کامیاب ہیں مگر جہاں تک موضوع و مواد کی اہمیت کا تعلق ہے 'دوگز زمین' بقول پروفیسر قمر رئیس:

"یہ صرف ایک کنبہ کی نہیں بلکہ ہندوستان کے لاکھوں مسلمان خاندانوں کی المناک داستان ہے...."

ہمارے پیش نگاہ جہاں تک اخلاقی قدروں کی نمائندگی کا معاملہ ہے اس سلسلے میں بھی 'دوگز زمین' اور 'خوابوں کا سویرا' کے کئی کردار بہت دیر تک قاری کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے لیے 'دوگز زمین' میں شیخ الطاف حسین کی اہلیہ بی بی صاحبہ (جو شیخ پورہ کی بچی سیدانی ہیں) اور ان کے داماد اختر حسین 'خوابوں کا سویرا' کے انوار احمد، ان کی اہلیہ عالیہ خاتون، صاحبزادے آفاق اور اسکی دوست پریس رپورٹر کلثوم اپنی اعلیٰ اخلاقی سیرت کے لیے یادگار کردار بن گئے ہیں، ناول کا مرکزی خیال تمام بنی نوع انسان کو انسانیت اور اخوت کا پیغام دیتا ہے اور شاید یہی عبدالصمد کے خوابوں کا سویرا ہے۔

حسین الحق کے ناول 'فرات' (۱۹۹۲ء) اور 'بولومت چپ رہو' بھی اخلاقی نقطۂ نگاہ سے اس دور کے کامیاب ناول ہیں۔ فرات میں وقار احمد کا پروقار کردار جو ہر لمحہ 'یادِ ماضی عذاب ہے یا رب' کی کسک محسوس کرتا رہتا ہے اور خود اپنے اور اپنے بچوں کے مابین جو جنریشن گیپ ہے، اس تھوڑے سے فاصلے نے اخلاقی اعتبار سے جو زوال کی صورتیں دکھائی ہیں، اس المیہ نے پیش نظر ناول کو گئے وقتوں کا نوحہ بنا دیا ہے۔ 'بولومت چپ رہو' کا ہیرو ہیڈ ماسٹر افتخار الزماں بھی وقار احمد کی طرح ہی اپنے اعلیٰ اخلاقی کردار سے قاری کو بہت دیر تک صرف متاثر ہی نہیں کرتا بلکہ ایک لمحۂ فکریہ بھی دیتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی اور غضنفر وغیرہ کے بھی کئی ناول منظر

عام پر آچکے ہیں، یہاں ان سب پر بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ ذوقی کے ناول 'نیلام گھر' پر چونکہ کم مباحثے ہوئے ہیں اس لیے اسی ناول سے مثال کے طور پر ایک عبارت میں پیش کرنا چاہوں گی:

''.....اور دیکھنا..... جب یہ ملک..... ہمارے اپنے لہو سے سینچا گیا یہ ملک ایک نئے سرے سے پھر جنم لے گا..... اور اس خوفناک آندھی کا دور دور تک پتہ نہ ہوگا کہ سارے کے سارے انجم ایک ایسا خوش رنگ لباس پہن کر نکلیں گے کہ آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی..... اور ملک، فلک سے غسل کر کے اس قدر پاکیزہ ہو جائے گا کہ دوسرے ملک والوں کی آنکھیں بھی پھٹ جائیں گی.....'' (نیلام گھر۔ص ۱۸۰)

کریم بیگ کے یہ الفاظ اگر چہ خوابوں کی سرزمین کے ہیں، مگر ان میں جو اخلاقی اور وطنی جوش و جذبہ ہے وہ محسوس کی جانے والی حقیقت ہے، وہ بات جس کی اولاد (انجم) جیل کی آہنی سلاخوں میں ہے مگر امید کا بادل باپ کو اس ملک سے اسی طرح باندھے ہوا ہے اور وہ اسکی پاکیزگی کو آلودہ کرنا نہیں چاہتا۔

پاکستانی رائٹر بانو قدسیہ کے ناول 'راجہ گدھ' میں رزق حلال و حرام کی بحث چھیڑی گئی ہے اور اخلاقی اعتبار سے یہ موضوع بھی خاصا اہم ہے جسے ناول کے کینوس پر مصنفہ نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ اسی طرح پیغام آفاقی کے ناول 'مکان' کی ہیروئن نیرا ہمارے اخلاقی اقدار کو اس طرح جھنجھوڑتی ہے کہ ہم بہت دیر تر فکشن، فن اور زندگی کے مثلث میں اس طرح گم ہو جاتے ہیں کہ فرار کا کوئی راستہ نہیں ملتا ہے۔ جدید ناول میں نیرا کی سیرت اخلاقی اقدار کے فروغ میں مثبت رول ادا کرتی ہے۔ موضوع و مواد کے اعتبار سے بھی اس ناول میں نیا پن ہے۔ گذشتہ دنوں ثروت خاں کے ناولٹ 'اندھیرا پگ' میں بھی اخلاقی نقطۂ نگاہ سے کچھ ایسے سوالات اٹھائے گئے ہیں جو غضنفر کے ناولٹ 'دویدانی' کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ ثروت خاں کے اٹھائے ہوئے سولات کا تعلق صرف ناول کے مرکزی کردار روپ کنور سے ہی نہیں ہے بلکہ اس اخلاقیات سے ہے جو نظام کہن کی پروردہ ہیں اور گھر کی ملازمہ تک یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ

''بھگوان کسی کو دھوا نہ کرے یوں روز روز مرنے سے تو اچھا ہے کہ وہ دھواستی ہو جائے تو ایک بار میں پاپ کٹے.....''۔

بیوہ کی زندگی پر بہت سارے ناول یا ناولٹ لکھے گئے ہیں اس ناولٹ میں ایسے سوالات اٹھائے جارہے ہیں جو ایک نئی اخلاقیات کو جنم دے رہے ہیں اور معمہ بن کر رہ جانے والی نسائیت کے لیے جینے کی راہیں آسان ہورہی ہیں۔

آنگن اور زمین پر (خدیجہ مستور)، بیانات اور نادید (سریندر پرکاش)، تلاش بہاراں (جمیلہ ہاشمی)، بے جڑ کے پودے (سہیل عظیم آبادی)، حسرت تعمیر (اختر اورینوی)، گیان سنگھ شاطر (گیان سنگھ) مسلمان اور آتش رفتہ کا سراغ (مشرف عالم ذوقی) فائر ایریا (الیاس احمد گدی) بہت دیر کردی (علیم سرور) پرچھائیوں کی وادی (انور عظیم) ندی، مہاماری (شموئل احمد) نمبردار کا نیلا (محمد اشرف) آنکھ جو سوچتی ہے (کوثر مظہری).....اور بستی (انتظار حسین) مورلی (ترنم ریاض) برف آشنا پرندے (ترنم ریاض) غرض اردو میں نئے ناولوں کا ایک جال سا بن گیا ہے۔ایک زمانہ تھا جب اردو میں ناول کی تعداد دوسرے اصناف کے مقابلے میں بہت کم تھی مگر دیکھتے دیکھتے انگنت موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے اتنے سارے ناول سامنے آگئے ہیں کہ کوئی بھی دعویٰ نہیں کرسکتا ہے کہ اس نے یہ تمام ناول پڑھ لیے ہیں۔مجھ ناچیز نے بھی اپنے محدود مطالعے کی روشنی میں محض چند ناولوں کے حوالے سے اخلاقی اقدار کے فروغ میں اردو ناولوں کا کیا رول رہا ہے اسے دکھانے کی کوشش کی ہے۔البتہ ایک بات جو میں نے شدت سے محسوس کی ہے وہ یہ کہ ناول نگار، حضرت ناصح یا صحافی نہیں ہوتے ہیں اور نہ انہیں ایسا ہونا چاہیے۔ناول سب سے پہلے ایک فن ہے، اس لیے یہاں اخلاقی قدروں کی افزائش یا نمائش بھی ایک ریشمی پردے بہ الفاظ دیگر تخلیقیت کے متقاضی ہیں ورنہ حضرت ناصح کی خشک نصیحت کی طرح ناول پڑھنا بھی محال ہوجائے گا۔

❁❁❁❁❁

اردو افسانوں میں اخلاقی قدریں

ڈاکٹر سید احمد قادری

ادب نہ صرف ہمارے سماج کا آئینہ ہے، بلکہ ہمارے احساسات و جزبات کے اظہار کا بہترین ترجمان ہے۔اپنے عہد کی لسانی، سیاسی، سماجی، معاشرتی تہذیبی، اور تمدنی عوامل کا عکس اس عہد کے ادب میں ملتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ فنکار، ادب کو ایمانداری کے ساتھ تخلیقی اظہار کا نہ صرف وسیلہ بناتے ہیں، بلکہ اپنے فکر و آگہی سے ادب کو حیات و کائنات کا اہم حصّہ سمجھ کر اسے زندگی سے قریب لانے اور سماجی و معاشرتی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں اپنی ذمّہ داریوں کو پورا کرتے ہیں۔بہترین ادب وہ ہے جو ہمارے اطراف میں پھیلی ہوئی زندگی اور اس کے مسائل کو سامنے لاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ یونان کی زندہ اساطیر، سوفوکیز کا ایڈی پس اور ارسطو کا کتھارسس وغیرہ ایسی مثالیں ہیں، جنھیں آج بھی فراموش نہیں کیا جا سکا ہے۔اس امر سے بھی ہم انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ اچھا اور معیاری ادب ہمیشہ سیاسی، سماجی، اخلاقی اور معاشرتی بحران میں ہی ظہور پزیر ہوتا ہے، اور یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ اردو افسانہ کو اپنے ابتدائی دور سے ہی مختلف عہد میں انتشار اور بحران کا ہی سامنا کرنا پڑا ہے، یہی وجہ ہے کہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہی افسانے زندہ ہیں، جن میں سماجی، سیاسی، اور اخلاقی زوال کے فسانے ہیں۔آج بھی ہم پر آشوب اور ہر سطح پر شدید بحران اور انتشار کے کیفیات کے ماحول میں جی رہے ہیں، سیاسی عدم استحکام، سماجی تعصب، افتراق، استحصال، رشتوں کا بکھراؤ، قدروں کا فقدان، فحاشی، عریانیت، قتل و غارت گری، منافقت وغیرہ ایسے حالات ہیں، جن سے ہم ، ہمارا سماج اور ہمارا ادب متاثر ہے۔ایسے ناگفتہ بہ حالات میں اخلاقی قدروں کی اہمیت اور افادیت کو سمجھنا ہوگا، اس کی روایات کو جاننا ہوگا۔اس لئے اردو افسانوں میں اخلاقی قدروں کی تلاش و جستجو سے قبل ہم ایک نظر اخلاقی قدروں پر ڈالتے چلیں۔

اخلاقی قدریں اپنے آپ میں وسعت و معنویت سے لبریز ہے۔یوں تو اخلاقی قدروں کی مختلف اصطلاحات اور تشریح ہیں، لیکن ہم اخلاقی قدروں کو دو حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں۔پہلا شخصی (ذاتی) اور دوسرا

غیر شخصی ۔ پہلے کا تعلق صرف اپنی ذات اور اس کی ضرورتیں اور اس کی غرض سے ہے، یعنی اپنی ذات کے حصار سے باہر نہیں نکلنا ، جبکہ دوسرے کا تعلق ٹھیک اس کے برعکس انسانی ہمدردی، محبت وخدمت خلق، رواداری، عدل وانصاف اور رحم وایثار سے ہے اور یہی عناصر دراصل اخلاقی قدریں ہیں ۔اس ضمن میں ماہر نفسیات ڈاکٹر محمد محسن نے اخلاقی قدروں کی نفسیات کو وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے.....

'' عام طور پر علمائے نفسیات نے سماجی تحفظ (social security) کی بنیادی ضرورت کو ہی اخلاقی قدروں کا سرچشمہ تصور کیا ہے ۔سماج کا رکن ہونے کی حیثیت سے ہر انسان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ دوسروں سے اپنے حقوق طلب کرنے کے ساتھ وہ دوسروں کے حقوق کی بھی پاسداری کرے۔محض ذاتی ضرورتوں اور خواہشوں کی تسکین پر اصرار معاشرہ کے اندر انتشار پیدا کردے گا۔جس کا اثر سماج کے ہر فرد کے ذاتی حفظ وامان پر پڑے گا۔اس لئے ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی ضروریات کی فراہمی سے بسا اوقات دستبردار ہونے کی عادت قبول کرے، تاکہ دوسروں کی حاجت کا سامان پیدا کرسکے۔اپنے اغراض کی قربانی کے ذریعہ صرف دوسروں کے مقاصد کی تکمیل کا راستہ راستہ نہیں کھولتا، بلکہ وہ اس توقع کی گنجائش پیدا کردیتا ہے کہ دوسرے بھی اس کے اغراض و مقاصد کا تحفظ کریں ۔دوسروں کے ساتھ رواداری و انصاف برت کر ہی دوسروں سے انصاف و رواداری کا طالب بن سکتا ہے ۔دوسروں کے ساتھ لطف وکرم کے ذریعہ ہی وہ دوسرون سے لطف وکرم کی توقع کرسکتا ہے۔اس طرح دوستی ، رواداری اور ایثار ان سبھوں کے ماخز انسان کے وہ بنیادی تقاضے ہیں، جن کے ذریعہ اس کے ذاتی مفاد و تحفظ کے سامان فراہم ہوتے ہیں ۔یہ ساری قدریں اس کے ذاتی اغراض و مقاصد کی تسکین کی آلہ کار ہیں ۔نیم وحشی انسان اپنی خواہشوں کی فی الفور تسکین کا طالب تھا ۔اس کے ہر فعل پر اصول نشاط (pleasure principle) کی کارفرمائی تھی''(نفسیاتی زاوئے ،صفحہ:۴۴،۴۵)

ڈاکٹر محمد محسن کی اس وضاحت سے یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اخلاقی قدریں در حقیقت انسانیت کے بنیادی تقاضے ہیں، جو انفرادیت کی بجائے اجتماعیت اور اس کے مثبت پہلوؤں کو آشکار کرتے ہیں۔ڈاکٹر محمد محسن بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اخلاقی قدریں جراحت ذات (self directed aggression) اور الفت غیر (other directed Love) سے مرکب ہے، وہ لکھتے ہیں.....

'' ہمیں اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہئے کہ اخلاقی قدریں جراحت ذات و الفت سے مرکب ہیں۔ساری اخلاقی قدروں کی عمارت ایثار و خدمت کی بنیاد پر قائم ہے اور الفت غیر و جراحتِ ذات کے سوتے ہی ان جزبات کی آبیاری کرتے ہیں۔محبت کے جزبہ کے بغیر بے لوث خدمت کا وجود نہیں ہو سکتا اور حقیقی ایثار کا رشتہ غمخواری و نفس کشی سے کبھی ٹوٹ نہیں سکتا '' (نفسیاتی زاوئے ،صفحہ:۴۹)

اس تناظر میں ہمیں اخلاقی قدروں کی وسعت اور معنویت کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔اس سیاق و سباق میں ہم اب دیکھیں کہ اردو افسانے میں اخلاقی قدریں کس طرح نمو پائی ہیں، اس کے لئے اردو افسانوں میں انسانیت کے مختلف بنیادی تقاضوں، مثلاً محبت، خلوص، رواداری، عدل و انصاف، سچائی، صلہ رحمی، شجاعت، حیا، صبر و تحمل، ایمانداری، خدمت خلق کا جذبہ کی کارفرمائیوں کو کس طرح برتا گیا ہے۔

اردو افسانے کے ابتدائی سفر تا حال پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اردو افسانے نے اپنے ابتدائی دور سے ہی کسی نہ کسی شکل میں اخلاقی قدروں کو موضوع بنایا ہے۔ویسے اردو افسانے کے ابتدائی سفر کے متعلق وقار عظیم کا خیال ہے کہ.....

'' مختصر افسانہ کا آغاز حقیقت اور شعریت، صداقت اور تصور، زندگی اور فن کے امتزاج کا ابتدائی نقش ہے، یہی نقش آگے چل کر زیادہ ابھرا، زیادہ چمکا اور زیادہ دلکش اور دل نشیں بنا ''(داستان سے افسانے تک، صفحہ: ۲۳۸)

وقار عظیم کے اس خیال کی تائید کرتے ہوئے ہم اردو افسانوں کے ابتدائی سفر پر نظر ڈالیں، تو ہمارے سامنے افسانوی ادب کا جو منظر نامہ نظر آتا ہے، وہ یہ ہے کہ پریم چند، نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، علی

عباس حسینی، حجاب امتیاز علی، مجنوں گورکھپوری، سلطان حیدر جوش، اعظم کریوی، حامد اللہ افسر، ل احمد اکبر آبادی، عصمت، منٹو، کرشن، بیدی، قاسمی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، اختر انصاری، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، رتن سنگھ، بلونت سنگھ، مہندر ناتھ وغیرہ جیسے افسانہ نگاروں کے ایسے سینکڑوں افسانے منظر عام پر آئے، جن میں اخلاقی قدریں مختلف روپ میں پوری معنویت اور وسعت کے ساتھ موجود ہیں، لیکن ترقی پسند تحریک کے اختتام اور جدیدیت کے آتے آتے حالات بہت تیزی سے بدلنے لگے۔ اردو افسانے کے رخ کو اجتماعیت سے انفرادیت کی جانب موڑ دیا گیا، اس وقت جدیدیت کے علم برداروں نے تجربہ کے نام پر زندگی اور اس کے عوامل کو محدود کر دیا اور صرف اپنی ذات کے خول میں سمٹ جانے کو ہی اہمیت دی، جس کے نتیجہ میں اردو افسانہ کی مقبولیت، اس حد تک کم ہوگئی کہ بعض نقادوں نے اردو افسانے کے خاتمے کا ہی اعلان کر دیا، لیکن اردو افسانے کی جڑیں اس قدر مضبوط تھیں کہ آٹھویں دہائی کے افسانہ نگاروں نے نہ صرف علامتیت اور لغویت کے خلاف صف آرا ہوتے ہوئے شکست ذات اور داخلیت کو رد کرتے ہوئے اجتماعیت اور سماجیت پر زور دیتے ہوئے تہذیبی اقدار کے افکار و عرفان کے اظہار کو اردو افسانوں کے لئے لازمی قرار دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ احمد یوسف، سریندر پرکاش، جوگیندر پال، رام لعل، غیاث احمد گدی، الیاس احمد گدی، کلام حیدری، اقبال متین، اقبال مجید وغیرہ جیسے افسانہ نگاروں نے اپنی جدت اور شدت پسند روئے میں تبدیلی کو ضروری سمجھا، حالات افسانوی ادب کے لئے سازگار ہوتے گئے۔ نتیجہ میں آٹھویں اور ساتویں دہائی کے افسانہ نگاروں نے اپنے فکر و فن، متنوع موضوعات، دلکش اسلوب سے ایک نئے افسانوی سفر کا آغاز کیا اور سماجی، سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی اقدار سے رشتہ جوڑتے ہوئے آگے بڑھے۔

اب میں چند مثالیں مختلف ادوار کے ایسے افسانہ نگاروں کے پیش کرنا چاہتا ہوں، جنھوں نے اپنے افسانوں میں سماجی قدروں کو اپنے مخصوص فکر و آہنگ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں جو نام سب سے پہلے سامنے آتا ہے، وہ ہے پریم چند کا، انھوں نے یوں تو ایسے بہت سارے ایسے افسانے لکھے، جن میں اخلاقی قدریں نہ صرف اہم موضوع بن کر ابھرتا ہے، بلکہ اپنے عصری مسائل اور قدروں کی بھی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اس ضمن میں پریم چند کا افسانہ '' ایمان کا فیصلہ '' کا بطور خاص ذکر کرنا چاہتا ہوں، جس میں واقعہ منشی ست

نرائن لال کا ہے جو اپنے مالک کا ایک گاؤں بے ایمانی کر کے اپنے قبضے میں کر لیتا ہے لیکن جب حقیقتاً ایمان اور عزت کا سوال آجاتا ہے تو اس سے جھوٹ نہیں بولا جاتا اور اپنی بے ایمانی کا اعتراف کر کے اپنی ایمانداری کا ثبوت دیتا ہے۔ایک اقتباس دیکھئے:

''تب بھان کنور نے ست نرائن لال کی طرف دیکھ کر کہا ''لالہ جی سرکار نے تمہاری ڈگری تو کر ہی دی، گاؤں تمہیں مبارک ہو۔مگر ایمان آدمی کا سب کچھ ہے۔''ایمان سے کہہ دو کس کا ہے؟''

یہ سوال سن کر ہزاروں آدمی منشی جی کی طرف حیرت آمیز استفسار کی نگاہوں سے تاکنے لگے۔منشی جی دریائے فکر میں ڈوبے دل میں نفس اور ایمان کے درمیان داؤں پیچ ہونے لگے۔ہزاروں آدمیوں کی آنکھیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔اصل واقعہ کسی سے پوشیدہ نہیں تھا۔اتنے آدمیوں کے روبرو جھوٹی بات زبان سے نہ نکل سکی۔غیرت نے زبان بند کر دی۔''میرا کہہ دینے میں کام بنتا ہے،کوئی امر نہ تھا،لیکن بدترین گناہ کی جو سزا دنیا دے سکتی ہے،اس کے ملنے کا پورا خوف تھا۔''آپ کا'' کہہ دینے میں کام بگڑتا تھا۔جیتی جتائی بازی ہاتھ سے جاتی تھی۔لیکن بہترین فعل کے لئے دنیا جو انعام دے سکتی ہے،اس کے ملنے کی امید تھی۔اس امید نے خوف کو دبا لیا۔انہیں ایسا معلوم ہوا گویا ایشور نے انہیں سرخرو بننے کا یہ آخری موقعہ دیا ہے۔میں اب بھی اپنے ایمان کو بچا سکتا ہوں۔اب بھی دنیا کی نگاہوں میں عزت پا سکتا ہوں۔انہوں نے آگے بڑھ کر بھان کنور کو سلام کیا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولے''آپ کا۔''

فتح حق کا ایک نعرہ بلند کمرہ میں گونجتا ہوا عالم بالا تک جا پہنچا جج نے کھڑے ہو کر کہا'' یہ قانون کا فیصلہ نہیں،ایمان کا فیصلہ ہے۔''

اس کے بعد قرۃ العین حیدر کے کئی ایسے افسانے بے اختیار ذہن میں آتے ہیں،جن میں اخلاقی قدروں کو مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔لیکن افسانہ '' جلاوطن '' کا انداز اس قدر اثر انگیز ہے کہ اس

سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاسکتا ہے۔ افسانہ ''جلاوطن'' میں عینی فکروفن کے لحاظ سے بھی کافی بلندی پر نظر آتی ہیں۔اس افسانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب اور قدروں کے واقعات کے تانا بانا کو جس انداز میں بُنا گیا ہے، وہ صرف تہذیبی اور تاریخی روایت کا سرچشمہ ہے، بلکہ تقسیم ہند سے جو مشترکہ تہذیب و تمدن کے بکھرتے شیرازہ کا جو المناک فضا بنائی ہے، اس کی زبردست ٹیس ہے، ایک اقتباس دیکھیں____

> 'رفیقو' انسان نے خودکشی کرلی۔پرانی اقدار تباہ ہوگئیں۔اپنے پرائے ہوگئے۔یہ سب پچھلے سال سے دہراتے دہراتے تم لوگ اکتا نہیں گئے۔یہ جو کچھ ہوا، یہی ہونا تھا اور آپ تھیں کہ ایک نہایت رومینٹک تصوّر لئے بیٹھی تھیں، گویا زندگی نہ ہوئی، شانتا رام کی فلم ہوگئی۔''　　　(جلاوطن)

ایسے خوبصورت، معنی خیز اور زندگی کے حرکت وعمل کو وسیع تناظر میں پیش کرنے والے، اس افسانہ میں موضوع سے لے کر کردار، واقعات تجسس، تحیر، تکنک، ٹریٹمنٹ، زبان، ماحول اور کلائمکس تک ایک خاص معنویت اور انفرادیت موجود ہے، جسے فراموش کرنا ممکن نہیں۔

حیات اللہ انصاری کا نام بھی اردو کے افسانوی ادب میں بے حد اہم اور معتبر ہے۔ان کا افسانہ ''ادایا قضا'' بھی حیات اللہ انصاری کا ایک اچھا اور معیاری افسانہ ہے، حکیم اعجاز حسین کی کردار سازی جس خوبصورتی اور فنکارانہ انداز میں کی گئی ہے، وہ قابل ستائش ہے۔

حکیم صاحب خدا کی عبادت کو ہمیشہ ہر کام پر اوّلیت دیتے۔یہاں تک کہ ان کے گاؤں میں ''طاعون'' جیسی موذی اور جان لیوا بیماری پھیل گئی۔اس بیماری میں ان کی بے حد عزیز اور لاڈلی بیٹی سلیمہ بھی چل بسی اور انھوں نے نماز قضا نہیں کی۔لیکن ان کی مصروفیت گاؤں میں پھیلی بیماری کی وجہ کر بڑھتی چلی گئی۔ شاہ ولایت حسین صاحب کی اس بات پر کہ ____ ''یہ تمہارا خیال غلط ہے کہ تمہاری بے توجہی سے کوئی مر جائے گا یا تمہاری توجہ سے کوئی بچ جائے گا'' پر پورا ایمان تھا۔لیکن دم توڑتے ہوئے انسانوں کی، ان کے احباب اور رشتہ داروں کا درد وکرب، چیخ پکار، حکیم صاحب کی نماز قضا کرادیتی ہے۔حکیم صاحب نے انسانی

خدمت کو ہی عبادت کا درجہ دیا۔ان کا ایک اور افسانہ ''شکستہ کنگورے'' بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہ افسانہ ایسے لوگوں کی کہانی سناتا ہے جو اپنی خستہ حال زندگی کو اپنے شاندار ماضی میں بدلنے کی جستجو اور آرزو میں مصروف ہیں۔انسانی ہمدردی،غریبوں کا دکھ،ان کا درد و کرب،زمینداروں اور ان کے لوگوں کا ظلم و ستم، نابرابری،ناانصافی،استحصال،مجبوری،بے بسی ـــــ یہ سب کچھ شکستہ حال منیر،جس کے دل میں اپنے شاندار ماضی کو واپس لانے کی تمنا اور آرزوئیں انگڑائیاں لیتی رہتی ہیں۔

> ''دادا میاں کی یہ کبھی کبھی کی ٹھنڈی آہیں منیر کے سینے میں جا کر زبردست ارادوں کی شکل اختیار کر لیتی تھیں کہ جیسے بھی بنے اپنی گذشتہ شان و شوکت واپس لاؤں گا۔اگر پھاٹک پر پھر ہاتھی نہ جھوما تو زندگی کس کام کی۔یہ عروج تو اپنا حق ہے۔''
>
> (''شکستہ کنگورے'' ص۔۸)

سہیل عظیم آبادی کے بھی ایسے کئی افسانے ایسے ہیں جو سماجی قدروں کے تعلق سے اہمیت کے حامل ہیں، ان کی سوچ تھی کہ دولت کی حرص و ہوس دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔پورا زمانہ اس کے پیچھے دوڑ رہا ہے،جس میں انسانی قدریں مجروح ہو رہی ہیں۔سماجی رشتے،رواداری،وضع داری سب کے سب دولت کی خاطر پامال ہو رہے ہیں۔اسے سہیل عظیم آبادی نے شدت سے محسوس کیا،جس کا اظہار انہوں نے اپنے کئی افسانوں میں بھرپور طنز کے ساتھ کیا ہے۔اس سلسلے میں ''دوسرے کنارے تک'' کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

> ''اسے اپنی ذات سے بھی نفرت ہونے لگی۔اور سماج سے بھی،جس میں وہ پیدا ہوا اور پل کر جوان ہوا تھا۔اس نے محسوس کیا کہ اس سماج میں روپیوں کی ہی قیمت ہے،اور آدمی کچھ بھی نہیں ہے۔آدمی بازار کی دوسری چیزوں کی طرح روپیوں کے لئے بکتا ہے اور روپیوں سے خریدا جاتا ہے۔''

مشہور افسانہ نگار رام لعل کی بھی عصری مسائل اور اخلاقی زوال پر گہری نظر تھی، وہ ایسے لوگوں سے نفرت کرتے ہیں جو سیاست میں،سماج میں اور معاشرے میں تعفن پھیلا رہے ہیں۔سیاسی،سماجی اور معاشرتی وقار کو مجروح کر رہے ہیں۔انسانی قدریں،سماجی رشتے اور معاشرتی تہذیبوں کو پامال کر رہے ہیں۔رام لعل

نے ان کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے۔اور چونکہ رام لعل ایک دردمند دل رکھتے ہیں، غریبوں اور مجبوروں سے ہمدردی رکھتے ہیں، اس لئے ایسے واقعات کو جب وہ پیش کرتے ہیں تو ان میں حقیقی اور فطری جھلک نمایاں ہوتی ہیں۔ایک اقتباسات دیکھئے :

''ان کا ایم۔پی ہونا سُن کر جھانسی والا انسپکٹر خوش ہوا تھا۔اس نے سوچا ایسے آدمی کے ساتھ کچھ زیادہ ہی اخلاق سے پیش آنا چاہئے۔کیا پتہ کب مہربان ہو جائے۔ہم لوگوں کی تقدیر تو انھیں کی مٹھی میں رہتی ہے''۔(ریسٹ ہاؤس۔صفحہ ۱۱۹)

اخلاقی قدروں کا نیا اور انوکھا انداز غیاث احمد گدی کے افسانہ ''بابا لوگ'' میں دیکھنے کو ملتا ہے۔اس افسانہ کا ایک اہم کردار ''بڈھا انکل'' ہے، یہ افسانہ'بابا لوگ' کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

''بابا لوگ سب کمرے میں آجاؤ۔ام تم کو کہانی سنائے گا''

بس اسی ایک جملے سے ایک خاص فضا پیدا کرنے کے بعد گدی لکھتے ہیں:

''پھر بابا لوگ یہ سُنتے ہی کمرے میں آگئے اور بڈھے انکل کو یوں گھیر لیا جیسے اکسمس کی ننھی ننھی موم بتیاں ہوں جو بڑے سے کیک کے چاروں طرف استادہ کردی گئی ہوں۔''

ان جملوں سے گدی ان حالات، ماحول اور فضا سے آگہی کراتے ہیں۔جن سے پورا افسانہ آگے بڑھتا ہے اور قاری کی دلچسپی انہماک، تحیّر میں اضافہ کرتا جاتا ہے۔قاری کہیں چونکتا ہے، کہیں فکرمند ہوتا ہے۔لیکن ایک بات ہے کہ ''بڈھا انکل'' کبھی بھی قاری کی ہمدردی نہیں کھوتا۔وہ شروع سے آخر تک ہمدردی کا مستحق نظر آتا ہے۔حالانکہ وہ ایک ناجائز لڑکی کا باپ ہے، جو بہر حال ایک گناہ ہے لیکن ''بڈھا انکل'' کے اس گناہ میں بھی ہمدردی کا جذبہ کارفرما ہے۔اس لئے کہ اس نے اپنی جنسی ہوس بجھانے کے لئے صاحب کی میم صاحب سے جنسی تعلق قائم نہیں کیا، بلکہ اس کی اس حرکت میں بھی ''بڈھا انکل'' کے اندر کی انسانیت اور رحم دلی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

غیاث احمد گدی کے ہم عصر افسانہ نگار کلام حیدری کا افسانہ ''مخی'' میں آدمی کی بے ضمیری اور اس کے

ساتھ ساتھ انسانی درد و کرب اور صلہ رحمی کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ کلکتہ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے، جس میں ایک بے روزگار نوجوان کی نفسیات اور اس کے ردعمل کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے مختلف سچوئیشن کے سہارے انسانی جبلت، اس کے اندر کی خامیوں اور خوبیوں کو اجاگر کرنے کی فنکارانہ کوشش ہے۔ اس افسانہ میں دو کردار کے داخلی اور خارجی کشمکش اور تصادم نے ایک خاص کیفیت پیدا کی ہے افسانہ کا واحد متکلم یعنی ''میں'' مولانا بخش سے ساٹھ روپئے اس کی بیوی کو منی آرڈر کرنے کے نام پر لے لیتا ہے اور روپیہ ملتے ہی اس کے اندر کی بے ایمانی کا عفریت اس کے اوپر حاوی ہو جاتا ہے اور ''میں'' خوش ہوتا ہے کہ وہ مولانا بخش کی بیوی اور بچوں کے لئے نہ جانے کتنے جتن سے اور اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کو مار کر جمع کئے گئے ساٹھ روپئے دھوکہ سے حاصل کرلیا ہے، لیکن وہی مولانا بخش جب ٹرک سے کچل کر مر جاتا ہے، تو اس ''میں'' کے اندر کی انسانیت اور اخلاقی قدریں جاگ جاتی ہیں اور وہ اپنی جیب سے سارے بچے ہوئے پیسے مولانا بخش کی لاش پر ڈال دیتا ہے، تا کہ اس کے کفن دفن کا بہتر انتظام ہو۔ معاشی بحران، آدمی کو کس حد تک بے ضمیر ی پر مجبور کر دیتا ہے، لیکن اگر آدمی کے اندر انسانیت اور انسانی اقدار اسے جھنجھوڑتی ہے تب وہ پشیمانی محسوس کرتا ہے۔

معروف افسانہ نگار زکی انور نے بھی اپنے کئی افسانوں میں اخلاقی قدروں کے شکست و ریخت کو موضوع بنایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زکی انور کا دل دردمندی سے معمور تھا یہی وجہ تھی کہ بعض اوقات چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی انھیں متاثر کرتی ہیں۔ مثلاً افسانہ ''اور بھی دُکھ'' کا یہ حصّہ ملاحظہ فرمائیں، جس میں گاؤں میں قحط سالی کے دوران گاؤں کے معصوم اور غریب انسانوں پر کیا کیا گزرتی ہے، اس کی صحیح عکاسی کی ہے۔

> ''اور یہ سب ان دنوں ہو رہا تھا، جب بہار کے اکثر علاقوں میں بھیانک قحط سالی تھی۔ سرفرسز احمد وہاں کی حالت دیکھ کر آئے تھے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ والینٹر چار چار میل سے پانی کا گھڑا اٹھائے لا رہے ہیں کہ کم سے کم کوئی پیاسا تو نہ مرے۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ صبح سویرے جوان کنواری لڑکیاں شہر کی طرف سے آتی ہیں اور ان کے کھونچے میں سیر دو سیر غلّہ، آنکھوں میں منوں لاج ہے اور وہ اپنی

بوجھل آنکھیں کسی سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں کر پاتی ہیں۔انھوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ رات جب پھیل جاتی ہے تو کسان اپنی پیاری گائیں اور ان کے بھولے بھالے بچے تھان سے کھولتے ہیں اور شہر کی طرف نکل جاتے ہیں اور صبح جب وہ شہر سے واپس آتے ہیں تو ان کی بغل میں غلّے کی گٹھری ہوتی ہے۔''

ساتھ ہی افسانہ کا یہ حصّہ بھی دل کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا جس میں زکی انور سلمٰی کی زبانی یہ بات کہتے نظر آتے ہیں۔

''بھابھی'' بیگم امتیاز کی پوری بات سنے بغیر بولی۔''بھوک اور بیماری..... یہ دو لفظ سنتے سنتے تو میں تھک گئی ہوں..... پاگل ہوگئی ہوں بھابھی قسم نور کی.....میرے کان پک گئے ہیں اور ایک دن بھوک اور بیماری کی رٹ میری جان لے لے گی.....بھوکا کون نہیں ہے بھابھی....میں بھوکی ہوں! آپ بھوکی ہیں، ساری دنیا بھوکی ہے۔یہ نسل ہی بھوکوں کی نسل ہے.....ہنگری جنریشن، بھوکی نسل، کس کس کا پیٹ بھریں گی آپ؟ کتنے کا علاج کریں گی آپ؟.....مٹ جانے دیجئے، ساری دنیا کو فنا ہو جانے دیجئے ،اس بھوکی نسل کو.....'' وہ کچھ بڑبڑاتی ہوئی اٹھی اور اپنے آنسو پونچھتی ہوئی ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی۔''(اور بھی دُکھ)

اردو افسانے ایک طرف جہاں اخلاقی قدروں کی اہمیت، معنویت اور وسعت سے بھرے پڑے ہیں، وہیں اخلاقی قدروں کے انحطاط اور زوال کو بھی مختلف دور کے افسانہ نگاروں نے بڑی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اجاگر کر کے انسانیت کو شرمسار ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔ اس ضمن میں شفیع مشہدی کا بڑا اہم افسانہ ''جلدی کرو'' پیش کیا جا سکتا ہے، جس میں مختلف Situation کا Picturization کر کے تاثر کو ابھارا گیا ہے۔

اس افسانہ کا موضوع عصر حاضر کی بربریت، قتل و خون ہے۔انسان کا لہو ہر جگہ بہہ رہا ہے کبھی بہار شریف میں، کبھی نیلی میں، کبھی پارس بیگھہ میں، کبھی.....اور ان انسانوں کی لاشوں سے لوگ اپنی اپنی دکانیں سجا رہے ہیں۔

''.....اس لڑکی کی تصویر کلوز اپ میں لو، جس کی گردن کٹی ہوئی ہے، لیس ویری گڈ، دیکھو، اس ننھے بچے کا فوٹو اس طرح لو کہ اس کے چہرے کی ساری Agony تصویر میں آسکے، مگر اس کی آنکھیں تو نکلی ہوئی ہیں؟ You Stupid جو میں کہتا ہوں کرو، تمہیں کیا پتہ کہ اس کا Display میں ٹائٹل کور پر کیا کروں گا۔ اور اس کا Caption...جلدی کرو، لیس ونڈرفل، ویل ڈن، مائی بوائے۔''(''جلدی کرو'')

شفیع مشہدی کا ایک دوسرا افسانہ ''سبز پرندوں کا سفر'' میں گرچہ علامتی اظہار بیان اپنایا گیا ہے لیکن اس افسانہ کا موضوع اور Treatment اسے اہم بناتا ہے، اور افسانہ کے مطالعہ سے شفیع مشہدی کا سماجی اور سیاسی شعور، فکری بصیرت اور فنی آگہی پوری طرح ابھر کر سامنے آگئی ہے۔ اور اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ فنکار کا ذہنی پرواز بلندیوں کو چھو رہا ہے۔

مفاد پرستی اور ریاکاری عہد حاضر کے سیاسی دور میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ وہ سماج اور سیاست کا حصہ معلوم ہونے لگی ہے۔ شفیع مشہدی نے ان برائیوں اور خامیوں کو بڑے فنکارانہ انداز میں مذکورہ افسانہ میں پیش کیا ہے۔ آج کا آدمی تھوڑے سے فائدے کے لئے سب کچھ کر گزرتا ہے۔ اقتدار کی ہوس اخلاقیات اور اقتصادیات سب پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ اخلاقی قدریں زوال پذیر ہیں، انسانی رشتے پامال ہو رہے ہیں۔ لیکن ان سب باتوں سے بے نیاز، لوگ اپنے اپنے مفاد میں مشغول ہیں۔

''جگدیش سنگھ نے لفافہ لیتے ہوئے کہا، حضور فکر نہ کریں ہم پرانے کھلاڑی ہیں کس کی جان بھاری ہے جو ووٹ دینے آئے گا۔ اتنے میں مؤذن کی اذان سے فضا گونج اٹھی ''حَیَّ عَلَی الْفَلَاح'' کے الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرا کر چور چور ہو گئے۔ ظاہر حسین نے اٹھتے ہوئے کہا، ہاں بھئی! تمہیں لوگوں پر بھروسہ ہے اب میں چلا، نماز کا وقت ہو گیا ہے، بقیہ باتیں کل ہوں گی''۔(سبز پرندوں کا سفر)

دور جدیدیت کے بعد جب اردو افسانے کی کھلی کھلی فضا سامنے آئی اور انسانی مسائل اور قدریں بھی موضوع بننے لگے، تو ایسے میں شفق جیسے جدیدیت کے علم بردار افسانہ نگار نے ''چٹکی بھر زندگی'' جیسا معنویت

سے بھرپور افسانہ لکھا۔اس افسانہ کو جس نے بھی پڑھا وہ ذہنی اور جذباتی طور پر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔یہ افسانہ اپنے ابتدائی جملوں سے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور جیسے جیسے افسانہ آگے بڑھتا ہے،اس میں تحیّر،تجسّس،جذباتیت کی شدّت نمایاں ہوتی جاتی ہے اور آخری جملہ ''پاپا میرا قصور کیا''؟ تک پہنچ کر ایسے معاشرے سے،ایسے سماج سے شدید نفرت کا جنم ہوتا ہے، جہاں بیٹیوں کی پیدائش کو ایک بوجھ،ایک مصیبت تصور کیا جاتا ہے۔اس افسانہ میں معاشرے میں بیٹی سے شدید نفرت اور یہ نفرت کیسے اخلاقی اقدار میں بدل جاتا ہے،اس کا خوبصورت انداز شفق کے اس افسانہ میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

عصر حاضر کے ایک اور افسانہ نگار مشرف عالم ذوقی کے بھی کئی افسانے ایسے ہیں،جن میں ذوقی نے pathos کی جو شدّت پیدا کی ہے اور قومی و بین الاقوامی سطح پر بارود کے ڈھیر پر بیٹھی انسانیت اور اس کی قدریں جس طرح کراہ رہی ہیں،اس کا پورا منظر نامہ بڑے ہی انہماک اور دردمندی کے ساتھ بیان کرتے ہیں،اس ضمن میں ذوقی کا افسانہ '' لینڈ اسکیپ کے گھوڑے '' کا بطور خاص ذکر کیا جاسکتا ہے۔

ان افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ اور بھی ایسے بہت سارے افسانہ نگار ہیں،جن کے افسانے اخلاقی قدروں کے بہترین مثال بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں،مثلاً، احمد یوسف،شوکت حیات، خالدہ اصغر، الیاس احمد گدّی،انتظار حسین، اقبال مجید،سلام بن رزاق، ذکیہ مشہدی،قمر جہاں اور انور امام وغیرہ کے کئی ایسے افسانے ہیں جو سماجی و معاشرتی زندگی کی تعمیر و تشکیل کے آئینہ دار ہیں اور عصری مسائل کو پوری جرأت اور حوصلہ کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

❁❁❁❁❁

حیرتؔ فرخ آبادی کی اقداری شاعری

پروفیسر احمد سجاد

جیوتی پرساد مصر احیرتؔ فرخ آبادی کے فکری وفنی مزاج کو سمجھنے کے لیے پندرہ برس (۱۹۴۵ء) کی عمر میں ان کی لکھی ہوئی نظم بعنوان ''ایک غریب طالب علم'' کو دیکھنا چاہیئے جس کی شان نزول یہ ہے کہ انہیں اپنے اسکول کے آٹھویں درجے کے ایک ساتھی کی دردناک زندگی کے انکشاف سے سخت حیرت وملال ہوا کہ اس کے والدین نابینا ہیں اور ایک چھوٹے بھائی کے لیے اسے ٹیوشن کے علاوہ سب کو کھانا پکا کے کھلانے کی بھی ذمہ داری ہے، جس کی کربناک زندگی کا نقشہ شاعر کی زبان میں کچھ اس طرح کا تھا:۔

بے مدد منجدھار میں بہتا چلا جاتا تھا وہ　　مشکلوں پر مشکلیں سہتا چلا جاتا تھا وہ

اس صورت حال پر شاعر کے درد دل کی ٹیس بھی ملاحظہ ہو:۔

درد کی اک ٹیس میرے دل کو تڑپانے لگی
مجھ کو اپنی زندگی سے شرم سی آنے لگی　(ص:۳۴۹)

علامہ اقبال نے رب کائنات کی عظمت وجلالت کو بیان کرنے کے لیے اپنی اولین نظم ''ہمالہ'' تحریر کی تھی تو حیرتؔ فرخ آبادی نے اخلاقی قدروں کا ہمالہ ''ایک غریب طالب علم'' کی شکل میں منظوم کر کے پیش کیا۔

حیرتؔ کی پوری شاعری کا جائزہ لیجیئے تو تقریباً ہر شعر دو قسم کے احساسات وجذبات کا ترجمان محسوس ہوگا اولاً 'طہارت نفس' اور دوم 'درد انسانی' کا اظہار مثلاً

آہوں کو سنوارا ہے، زخموں کو سجایا ہے　　ہم نے یہ شعور غم اک عمر میں پایا ہے

زندگی اک آئینہ ہے دوست　　جیسا تو ہے دکھائی دیتا ہے

مرے بھائی، مرے ہم جنس، میری ماں بہنیں　　بربریت کے شکنجے میں کسے جاتے ہیں

ہاں ہر اک دستو کا اک بھاؤ ہوا کرتا ہے　　اور بہت چیزیں یاں بے بھاؤ ہی بک جاتی ہے

ہے یہ دنیا یہاں انسان کی قیمت کیا ہے

شاعر زندگی کو غم و آلام سے نجات دلا کر اسے خوبصورت بنانے کا متمنی ہے تا کہ زندگی زندگی کے کام آئے اور درد ہی درد کا علاج بنے یہی دلیس اور دنیا کا رواج بن جائے۔ حیرتؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں مگر غزل کے علاوہ نظم، گیت اور قطعات میں بھی اسی طرح کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کو فنی پیکر میں ڈھال کے پیش کرتے ہیں چنانچہ درجنوں مشہور ناقدین نے ان کے ''حس التماس''، کریم النفسی، رواداری، انسان دوستی، کوش نصیحت نیوش، حب الوطنی، صداقت شعاری اور خیر پسندی کا برملا اعتراف کیا ہے اور کیوں نہ ہو کہ بڑے حادثاتی انداز میں حسن اتفاق سے ان کی ذات میں دنیا کے تین بڑے مذاہب کی اعلیٰ اخلاقی قدریں جمع ہوگئی ہیں۔ ان کے والد ایک ہندو برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو عیسائی پاسٹر ہو کر مشن ہائی اسکول فرخ آباد میں دینیات کے ٹیچر ہو گئے اور والدہ ایک مسلم خاندان سے تعلق رکھتی تھیں مگر حالات نے انہیں اپنے والد کے ساتھ عیسائی مذہب قبول کرنے پر آمادہ کر دیا۔ یوں ان کی ذات ہندو، عیسائی اور اسلام تینوں مذاہب کا سنگم بن گئی۔ اس پر حالات کی ستم ظریفی یہ کہ کم سنی ہی میں حیرتؔ سات بھائی بہنوں کے ساتھ والد سے محروم ہو گئے۔ چنانچہ ایک عرصہ تک عسرت کے ساتھ زندگی کی کڑی دھوپ جھیلنی پڑی۔ ایک انٹرویو میں ان کا بیان ہے کہ:

> ''والدہ محترمہ کی تربیت اور والد صاحب کی روزانہ زندگی کے واقعات نے مجھے انسانوں سے محبت کرنا سکھایا۔ ویسے بھی میری رگوں میں پہلے سے ہی تینوں بڑے مذاہب کا خون رواں ہے۔ آپ کو میری شاعری کا تین چوتھائی حصہ غم اور قومی

یکجہتی کے اردگرد گھومتا نظر آئے گا۔ یہی میری شاعری کی تحریک ہے۔ آپسی لڑائی جھگڑے، کشت وخون، رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ، بے وجہ انسان کو مذہبوں کی آڑ لے کر آپس میں پھوٹ ڈالنا اور لڑانا، مذہبی ظاہر داری یہ ساری چیزیں جب دل و دماغ کو جھنجھوڑتی ہیں اور بے چین کر دیتی ہیں تو پھر وہ شعر کی صورت میں کاغذ پر نمودار ہو جاتی ہیں''۔ (حیرت فرخ آبادی۔ فن اور فنکار۔ ص ۵۴،۵۳)

انسانی اخلاقیات کی تاریخ گواہ ہے کہ اخلاق دراصل مذہب یا دین دھرم ہی کی پیداوار ہے۔ جسے پروان چڑھانے کے لیے انسانوں کے پیدا کرنے والے نے دوٹھوس اور عملی طریقے اختیار کیے ہیں اولاً اس کی فطرت میں اس کی وفاداری اور بندگی کی آزمائش کے لیے تقویٰ یعنی نیکی کے ساتھ فجور یعنی بدی کو بھی ڈال دیا ہے اور دوسرے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں اور رسولوں کا سلسلہ قائم کر دیا۔ اولین انسان آدمؑ وحواؑ کو دنیا میں بھیجا گیا تو وہ پیغمبر یا نبی بھی تھے۔ لیکن وقفہ وقفہ سے انسانوں نے انبیا کی تعلیمات میں کتر بیونت کرنے کے سبب انہیں آزمائش اور عذاب الٰہی میں بھی ڈالا گیا۔ جن تین مذاہب کا اوپر ذکر آیا ہے ان کے یہاں بھی ''برہمنزم، پادری ازم اور ملا ازم'' نے بڑا فساد برپا کیا ہے، جس کے ردعمل میں پچھلی تین سو سالہ انسانی تاریخ نے عجیب عجیب فکری وعملی قلابازیاں کھائی ہیں۔ ایسے مفکرین اور سائنس داں پیدا ہو گئے جنھوں نے سرے سے مذہب ہی کا انکار کر دیا۔ کسی نے اسے افیون سے تعبیر کیا تو کسی نے ضعیف الاعتقادی کا ذریعہ بتایا۔ چنانچہ بہت سے علوم وفنون کی اٹھان بھی مذہب مخالفت اور خدابیزاری پر منتج ہوئی۔ خداپرستی کے بجائے مادہ پرستی کو رواج دیا گیا اور مادہ پرستی نے جزو پرستی کو ہمیز کیا۔ جس کے نتیجے میں ڈارون کی ارتقائیت، میکیاویلی کی وطنیت، کارل مارکس کی اشتراکیت، فرائیڈ کی جنسیت، ایڈلر کی لاشعوریت، ینگ کی اساطیریت اور ژاں پال سارتر کی وجودیت وغیرہ نے علم وادب، اخلاق وسیاست کو وقتی نفرت اندوزی، ظلم وجبر، استحصال اور قتل وغارت گری سے بھر دیا۔

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندان مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے
(اقبالؔ)

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
(اقبالؔ)

پچھلی بیسویں صدی کے اوائل تک مذہب بیزاری کی یہ لے حاوی رہی لیکن زندگی کی اس مذہبی یا روحانی تعبیر کو پس پشت ڈال دیا تو انسانی واخلاقی ہی نہیں کائناتی بحران بھی پیدا ہونے لگا، گلوبل وارمنگ، اوژون کا سوراخ، کاربن ڈائی آکسائیڈ زہر کی فراوانی، فضا کی آلودگی اور صاف پانی کی شدید قلت نے خود مغربی دانشوروں اور تخلیق کاروں کو بھی تشویش میں مبتلا کر دیا۔ ٹی ایس ایلیٹ نے اسے "ہوش مندی کا انقطاع" اور روژموں نے اسے "وحشت و بربریت کی کامیابی" پر محمول کیا۔

میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیران خرابات (اقبالؔ)

اب تو سائنسی تحقیقات کی روشنی میں بھی اس خدا بیزاری یا جزو پرستی کے بجائے کلی وتعمیری فکر و نظر کے شواہد بھی منظر عام پر آنے لگے ہیں۔ لوگ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اس کارحیات کو چند سالہ جہان فانی تک محدود رکھنے کے بجائے حقائق ابدی تک دراز کیا جائے۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

> "مذہب دراصل ایک ہے صرف اس کے بیرونی مظاہر، رسومات اور تہوار الگ الگ قرار پا گئے ہیں۔ مذہب کی جڑیں مختلف نہیں بلکہ ان کے پتے اور شاخیں جدا جدا ہیں، ان کی روح مختلف نہیں۔"

سوال یہ ہے کہ اخلاقیات کا تصور مذہب کے سوا کہیں سے آ ہی نہیں سکتا تو پھر مذہب کو انفرادی مسئلہ قرار دے کر حیات و کائنات کے جملہ شعبوں سے اسے بے دخل کیوں کر دیا گیا۔ اس کی اصل وجہ مادیئین کا یہ خوف کہ اخلاقیات کے ساتھ کہیں پورا مذہب نہ چلا آئے۔

دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ ساری دنیا میں جزو پرستی کے باوجود جو اخلاقیات کارفرما ہے اس کی اصل کمزوری یا مذہبی اخلاقیات سے اسکا بنیادی فرق کیا ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ سیکولر ممالک نے بقول شخصے ''تصور گناہ'' کے بجائے ''تصور جرم'' کے ساتھ اسے تسلیم کیا ہے۔ جرم محض ایک سماجی حقیقت ہے، گناہ سے انسان کا پورا وجود متاثر ہوتا ہے۔ جرم کا اثر مشکل سے انسانی ذہن سے آگے جا پاتا ہے۔ اس لیے منکرین مذہب نے ہر پاپ کو عملاً اپنے لیے جائز قرار دے دیا ہے۔ اس منافقت کی وجہ سے ان کے اندر کوئی احساس جرم، اضطراب یا خلش پیدا ہی نہیں ہو پاتی۔ اس نمائشی یا منافقانہ اخلاق کی صورت حال ساری دنیا میں اس طرح ہے۔

خلاف شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں　　مگر اندھیرے اجالے میں کبھی چوکتا بھی نہیں

(داغ)

کیونکہ اخلاقیات دراصل شعور بندگی اور اس کے خدا اور انسانوں کے ساتھ تعلق پر اطلاق کا نام ہے۔ جس کی تین جہتیں بڑی ہمہ گیر ہیں:۔

(۱) روحانی جہت (۲) جمالیاتی جہت اور (۳) افادی جہت

یہ ہمہ گیر مذہبی تصور خدا اور انسان کو ظاہر اور باطن دونوں جگہ اخلاقیات کا پابند بناتا ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد تصور آخرت میں پیوست ہے۔ عقیدۂ آخرت کی اہمیت یہ ہے کہ وہ نفس کی فرعونیت کو چیلنج کرتا ہے کہ دنیائے دنی فانی ہے، موت لازم ہے، بالآخر اپنے خالق و مالک کے سامنے جوابدہی کرنی ہے، ہر چیز لکھی جا رہی ہے جو میدان حشر میں پیش ہوگی۔ یہ تصور انسان کو حقیقی اخلاقیات پر عمل کی طرف مائل و مجبور کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذاہب نے خدا اور انسانوں سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے، سب سے زیادہ سچ بولنے والے، خیر پیدا کرنے والے، نرم خو اور اپنے وسائل میں دوسروں کو شریک کرنے والے پیدا کیے ہیں جس کی واحد وجہ تصور خدا و آخرت ہے۔

اس کے برعکس ''احساس جرم'' پر اکتفا کرنے والے افراد تو جانے دیجئے بڑی اقوام کو کھلی دھاندلی اور ظلم وستم پر آمادہ کر رکھا ہے۔آج بڑی طاقتیں جنگیں ایجاد کر رہی ہیں اور کمزور اقوام پر جارحیت مسلط کر رہی ہیں۔بارش کے زمانے میں دریا کے بندوں کو کاٹ کے محض مادی فائدے کے لیے مصنوعی سیلاب کے ذریعہ لاکھوں نہیں کروڑہا کروڑ افراد کو موت، بیماری اور غرقابی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

اس تناظر میں حیرت فرخ آبادی کی شاعری کا مطالعہ زیادہ معنی خیز ہوگا کیونکہ ان کے یہاں جن تین بڑے مذاہب کا سنگم قائم ہوا ہے اور جس کی وجہ سے تقریباً تمام ہی ناقدین نے ان کی خدا پرستی، انسان دوستی، حب الوطنی اور فسانۂ ہستی کے مختلف عناوین کا تذکرہ کیا ہے وہ شعوری اور غیر شعوری دونوں جہتوں سے ان کے فکر وفن میں خون کی طرح جاری وساری ہے۔حیرت نے مذکورہ ''مکالمہ'' کے دوران ایک سوال کے جواب میں اپنی مقصدی واخلاقی زندگی کا اعتراف رابرٹ فراسٹ کے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''یہ دنیا بہت خوبصورت اور پر کشش ہے اور یہاں کی خوبصورت چیزیں ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہیں لیکن ہمارے خالق نے ہر انسان کو ایک مقصد دے کر پیدا کیا ہے.....ہم اس مقصد کو جو اس نے ہمیں دیا ہے پورا کرنا ہے اس سے پہلے کہ ہم ابدی نیند سو جائیں (ایضاً ص ۴۹)

اور وہ مقصد ہے آدمی کو انسان بنانا کیونکہ مذہب صرف پیار ومحبت کی تعلیم دیتا ہے۔بشرطیکہ ہم اپنی مذہبی کتابوں کو خود بغور پڑھیں نہ کہ کٹر پادری، پنڈت اور مولوی کے نقطۂ نظر سے۔وہ ذیل کے الفاظ میں مزید وضاحت کرتے ہیں کہ:

> ''کسی بھی مذہبی کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے آپ کو دوسروں سے نفرت

کا پیغام کہیں بھی نظر نہیں آئے گا.....مذاہب تو آدمیوں کو انسان بناتے ہیں''۔(ایضاً ص ۵۹)

اب اسی خیال کا عملی نمونہ ملاحظہ ہو کہ گجرات کے بدنام زمانہ قتل عام کے معاً بعد کسی کام سے انہیں بڑودہ ۲۰۰۳ء کے آخری ہفتہ میں جانا ہوا تو فارغ وقتوں میں انسانی درد کی وجہ سے وہ ان علاقوں میں گئے جو وحشیانہ مظالم کے شکار ہوئے تھے۔وہاں لوگوں سے ملے،ان کی بستیاں دیکھیں۔اس کے بعد ایک چپ سی لگ گئی۔

جب وہاں سے لوٹے تو کچھ دن کے بعد یہ غزلیں ہوئیں جن کے مطلع یوں ہیں:۔

(۱)　یوں تو ساری فضا کھلی سی ہے　　یہ ہوا کیوں گھٹی گھٹی سی ہے

(۲)　لوگ مدت میں بنا پاتے ہیں گھر　　زلزلے آتے ہیں گر جاتے ہیں گھر

(۳)　جنون آوارگی ہر اک سو لیے پھرا ہے تھما نہیں ہے

سفر یہ یار و عجب سفر ہے رواں دواں ہے رکا نہیں ہے۔　　(ص ۵۹)

مگر حیرت کا شعری سفر تیز خرام نہیں بلکہ اقداری ہونے کے سبب معتدل خرام ہے اور خاندانی تربیت نیز غور و فکر کی عادت نے انہیں فکر و فن کے معاملات میں بھی محتاط بنا دیا ہے ایک قطعہ میں اپنے شعری محرکات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

یوں تو شریانوں میں ہر لحظہ سسکتا ہے لہو　　چوٹ لگتی ہے تو زخموں سے ٹپکتا ہے لہو

حد سے بڑھ جاتی ہے جب تن کی جلن من کی گھٹن　　صورت شعر میں تب جا کے لہکتا ہے لہو (ص ۵۵)

اتنا ہی نہیں جب یہ جذبہ حد ''دیوانگی'' میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ اس کے ممنون و مشکور ہوتے ہیں:

؎　یہ درد و غم یہ شاعری، حیرت اسی کی دین ہے

ممنون ہوں، مشکور رہوں، کیا کیا دیا 'دیوانگی'

ے　　یہ شعر ترے سنے گا جو بھی، یہی کہے گا کہ آج حیرت
ہوا ہے پاگل یا پی گیا ہے، بہک گیا ہے، گر انہیں ہے

اس کا یہ مطلب نہیں کہ حیرت کسی قدیم اور جامد اخلاقی نقطۂ نظر کے قائل ہیں ان کے یہ دو شعر پڑھیے۔

ے　　وقت کے ساتھ بدل جاتا ہے انداز سخن
شاعر آزاد ہے لہجے کئی اظہار کے ہیں
شعر سچا وہی ہے جس میں حقیقت ہو بیان
باقی نقادوں کے جھگڑے ہیں سب بیکار کے ہیں۔　　اور

ے　　کیا عجب صنف ہے غزل حیرتؔ　　روپ ہر دور میں بدلتا ہے

قدری شاعر ہوا کے ہر جھونکے پر اپنا رخ نہیں بدلا کرتا چنانچہ اس ساٹھ سالہ شاعری کے دور میں انہوں نے ادب لطیف، ترقی پسندی، رومانیت پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی دم بدم ادبی یلغاروں کو دیکھا اور پرکھا تو کبھی کبھی ان کی بعض مثبت اور صحت مند عناصر کو سراہا بھی مگر اردو غزل کی جان نازک پر جس طرح ستم پر ستم ڈھائے گئے اس پر حیرت کا ردعمل قابل غور ہے۔

نئی غزل تو رہی صرف ذہن تک محدود　　کوئی بھی شعر تو دل میں اتر گیا ہوتا

قدری اور تعمیری فکروفن کا شاعر انسانی مصائب و آلام سے متاثر اور اس کے اظہار میں بیشک نہایت حساس ہوتا ہے۔ع　"درد ہی ٹھہرا جیون ساتھی تجھ سے پہلے جائے کیوں (ص ۳۷۶)۔ع ہو نہ گر آہ تو شاعری کی نوا کیا ہوگی"۔

غرض ان کی شاعری قدری بھی ہے اور رجائی بھی اسی لیے نظم و غزل کے بیشتر اشعار دردانسانی

میں ڈوبے ہوئے ہیں تو قومی یکجہتی کے جذبات سے سرشار بھی ہیں۔

مگر وہ قنوطی نہیں رجائی اور حقیقت پسند ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زندگی ایک آئینہ ہے دوست　　جیسا تو ہے دکھائی دیتا ہے

زندگی روتی ہے، ہنستی ہے سنبھل جاتی ہے　　کبھی سایہ تو کبھی دھوپ نکل آتی ہے

مرے رفیق کچھ اپنے جہاں کی بات کرو　　زمیں پہ رہ کے نہ تم آسماں کی بات کرو

یہ حیرتؔ کی حقیقت پسندی ہی ہے کہ وہ اپنی مادری زبان سے بے حد جذباتی تعلق رکھتے ہیں آخر مجنوںؔ اور فراقؔ کے شاگرد جو ٹھہرے۔ اسی لیے جا بجا اردو کے تذکرے کے ساتھ ''ہماری اردو'' اور ''میری اردو'' لکھنا نہیں بھولتے اس کے باوجود زبان و بیان کے بدلتے رجحانات اور فکر و فن کے بدلتے میلانات سے صرف نظر نہیں کرتے۔ آسان زبان اور جا بجا ہندی کے عام فہم الفاظ کو برجستہ استعمال کرنے کا ہنر انہیں خوب معلوم ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی صاحب نے تو اپنے مقالہ کا عنوان ہی ''سہل ممتنع کا منفرد شاعر'' تحریر کیا ہے۔ حیرت کے لفظوں میں ''جانے ہم کھوٹ کا بیوپار کریں گے کب تک'' کیونکہ ''یہاں چار پیسے میں گیت ہر اک وستو اور بہت سی چیزیں بے بھاؤ ہی نہیں بکتیں بھگوان بھی بک جاتا ہے'' اس لیے کہ

ع　　ہے یہ دنیا یہاں انسان کی قیمت ہی کیا ہے (ص ۳۵۵)

ایک سوال کے جواب میں حیرت نے بڑی خاکساری اور بے تکلفی سے یہ فرمایا کہ میرا ایک بھی شعر بعض مشاہیر کے اشعار کی طرح آج زبان زد نہیں۔ لیکن اردو شاعری کا ایک اوسط قاری بھی جب ان کے مجموعہ ہائے کلام ''نوائے ساز دل'' (۱۹۸۸ء) ''حس التماس'' (۲۰۰۸ء) اور ''جو کریدے گھاؤ من کے (ہندی ۲۰۰۹ء) کے بعد اب ''حیرت فرخ آبادی۔ فن اور فنکار'' (۲۰۱۵ء) کا سرسری مطالعہ بھی کرے گا تو ان کی قادر الکلامی، ندرت اسلوب، طہارت فکر، صداقت خیال، جمالیاتی کیف،

رجائی انداز، قدری شاعری اور عصری آگہی و سماجی شعور کے اعتبار سے اردو کے شعری سرمائے میں ایک باوقار اور معیاری اضافہ تصور کرے گا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

اردو تحقیق اور اخلاقی قدریں

ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی

ریڈر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی

قاضی عبدالودود کے نزدیک تحقیق کسی امر کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کا عمل ہے۔ یعنی حقیقت واقعہ یا اصل شکل بذات خود موجود ہوتی ہے۔ تحقیق کو حق وصداقت کی تلاش وجستجو سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ غیر منکشف حقائق کی ایک منظم اور مربوط تلاش ہے جو انداز فکر سے پروان چڑھتی ہے اور ہمیں حقیقت وحکمت جاننے کی طرف مائل کرتی اور بیانات یا امور کی اصلیت کا سراغ لگانے پر آمادہ کرتی ہے۔ حق کی تلاش کے مرحلے میں متعدد مفروضات، عقیدے، تصورات اور خیالات نہ صرف تہس نہس ہوتے ہیں بلکہ قدما اور متاخرین کے قائم کردہ نظریات کی عمارتیں بھی منہدم ہوتی ہیں۔

یوں تو اردو کی مختلف نثری اور شعری اصناف میں اخلاقی اقدار کی کارفرمائی نظر آتی ہے لیکن اردو تحقیق، اخلاقی قدروں کے لحاظ سے تنقید پر تفوق رکھتی ہے۔ ان معنوں میں کہ جہاں تنقید تصور، نظریے اور تاویلات کی روشنی میں اپنا سفر طے کرتی ہے وہیں تحقیق، حق اور تلاش وجستجو کے وسیلے سے استنباط نتائج تک پہنچتی ہے۔ ایک محقق کے لیے جو بنیادی لوازم تصور کیے گئے ہیں وہ اصلاً اس کے خصائص ہیں۔ ان میں حق گوئی، غیر متعصب وغیر جانبداری، دنیاوی اغراض ومقاصد جیسے دولت، انعام اور ترقی عہدہ سے بے نیازی، صبر واستقلال، توازن واعتدال، اخلاقی جرات مندی وغیرہ جیسے اوصاف کو محقق کی فطرت میں شمار کیا گیا ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ اوصاف حمیدہ اخلاقی اقدار کے بطن سے ہی جنم لیتے ہیں۔

اردو میں تحقیق کی روایت کے اولین نقوش تذکروں میں ملتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ رائے زنی اور تاثر کے غلبے نے اس کی تحقیقی حیثیت کو ساقط الاعتبار کر دیا ہے۔ اردو کے ادبی ارتقا کے ساتھ تحقیق وتنقید کا مذاق بھی اعلیٰ اور بلند ہوتا گیا اور جانچ پرکھ کے اصول وضوابط بھی متعین ہوئے۔ نتیجتاً تذکرہ نویسی کی جگہ تاریخ اور قیاس کی جگہ تحقیق نے لے لی۔

گذشتہ صدی تحقیق وتدوین کے لحاظ سے خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔اس میں کئی تحقیقی نوادر وجود میں آئے۔قدیم متن اور مخطوطات کی دریافت ہوئی اور متعدد عمومی عقیدے اور تصورات کالعدم قرار پائے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں جن محققین نے اردو تحقیق کو معیار اور وقار عطا کیا ان میں حافظ محمود شیرانی، امتیاز علی خاں عرشی اور قاضی عبدالودود کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ان بزرگوں نے تحقیق کے اصول پائیدار بنیادوں پر قائم کیے اور جدید مغربی اصولوں کو رواج دیا۔انہوں نے حوالے درج کرنے میں ذمہ داری سے کام لیا اور مختلف ماخذ اور ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات پر جرح اور تعدیل اور احتساب کی صحت مند روایت قائم کی۔علاوہ ازیں تحقیق کو ترتیب مقدمات اور فکری تنظیم سے آشنا کیا اور اسے اختصاصی طور پر ایک ذمہ دارانہ عمل قرار دیا۔

اردو تحقیق میں آزادی کے بعد جو شخصیتیں نمایاں طور پر ابھریں اور جنہیں ان کی گراں قدر تحقیقی خدمات کی وجہ سے یاد کیا جائے گا۔ان میں گیان چند جین، تنویر احمد علوی، مختار الدین احمد، رشید حسن خاں، نثار احمد فاروقی، حنیف نقوی، علی محمد خسرو اور خلیق انجم کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔بلاشبہ ان محققین نے اپنی تلاش وجستجو سے اردو شعر وادب کے مطالعے کی گمشدہ کڑیوں اور نامعلوم گوشوں کو دریافت کر کے ایک بڑے خلا کو پر کیا اور اپنے غور وفکر اور کاوش کے حدود میں اردو کے ادبی مطالعے کی خامیوں اور نارسائیوں کو دور کرنے اور صحت و وسعت عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔یہ عجیب بات ہے کہ گذشتہ تین دہائیوں میں اردو تحقیق کے افق پر وہی نام گردش کر رہے ہیں جو آزادی کے بعد منظر عام پر آئے تھے۔اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اردو تحقیق داخل ہو چکی ہے لیکن کوئی نیا نام ابھی تک ابھر کر سامنے نہیں آیا جس سے یہ توقع کی جائے کہ وہ اکابرین کی روایت کا پاسدار ہوگا۔گذشتہ تین دہائیوں میں اردو تحقیق اور تدوین میں معیار کی سطح پر جو گراوٹ آئی ہے وہ لمحہ فکریہ سے کم نہیں۔جسے اخلاقی پستی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

سلمیٰ یاسمین نجمی۔ اخلاقی قدروں کی ایک ممتاز فکشن نگار

روبینہ نسرین، ایم، اے گولڈ میڈلسٹ

ریسرچ اسکالر

والدین نے نام سلمیٰ یاسمین رکھا۔ان کے والد کو سسرال کی طرف سے نجمی کا نام ملا۔لہٰذا جب انہوں نے لکھنا شروع کیا تو وہ سلمیٰ یاسمین نجمی بن گئیں۔29 اپریل 1941ء میں دہلی میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد سید سخاوت علی رضوی، سادات کے ایک اچھے گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔ان کے خاندان کا ذکر تذکرۂ اولیاء میں موجود ہے۔انہوں نے حضرت نظام الدین اولیاء کے ہاتھ پر بیعت کی۔حضرت امیر خسروؒ ان کے آباءواجداد میں شامل ہیں۔والد دلی کے مشہور بزرگ عبدالسلام شاہ نیازی سے بیعت تھے اور وہ ان کے ابا سے بہت پیار کرتے تھے۔سید کہہ کر بلاتے تھے۔ان کی پیدائش پر انہوں نے ان کی تحنیک بھی کی۔یعنی اپنا جھوٹا چٹایا۔ان کے بزرگوں کا ذکر تزک جہانگیری میں بھی ملتا ہے۔

ان کے نانا شاعر تھے۔تقسیم ہند کے بعد وہ لوگ کوئٹہ میں ان کے پاس آگئے۔ان کے نانا اکثر مشاعروں میں جاتے۔خاص طور پر جشن کے موقع پر وہ بھی ان کے ساتھ گئیں اور اسٹیج پر ان کے ساتھ بیٹھیں۔

ایک سال کے بعد وہ لوگ سیالکوٹ آگئے۔ان کے والد پولس انسپکٹر تھے۔امی نہایت دیندار اور ایک دینی جماعت کی رکن خاتون تھیں۔لہٰذا گھر میں شروع سے دینی ماحول مل گیا تھا۔ان دنوں محترمہ حمیدہ بیگم صاحبہ بھی سیالکوٹ میں تھیں۔ان کی امی انہیں ان کے پاس بھیج دیا کرتی تھیں۔اردو پڑھنی تو چار پانچ سال کی عمر میں ہی آگئی تھی۔یہاں ڈھیروں ڈھیر ''پھول'' رسالے مل گئے۔وہ بس دن رات پر چھتی پر چڑھی رسالے پڑھتی رہتی تھیں۔ان کے شوہر حمید اللہ صاحب مستقل بیمار تھے۔وہ کہتے کہ سلمیٰ پھول پڑھتی ہے یا کھاتی ہے۔ان کو مطالعے کی ایسی چاٹ پڑی کہ کچھ نہ پوچھیں۔جو ہاتھ آیا پڑھ ڈالتی تھیں۔یہاں تک کہ سودے والے لفافے کھول کر بھی جو لکھا ہوتا پڑھ لیتی تھیں۔

سیالکوٹ قلعے پر ان کی رہائش گاہ تھی۔ وہاں لائبریری بھی تھی۔ بچوں کی جتنی کتابیں مل سکتی تھیں، پڑھ ڈالیں۔ خاص طور پر پیسہ لائبریری کی کتابیں، کتابوں کے ٹائٹل پر پیسے بنے ہوتے تھے۔ وہ آٹھ سال کی عمر میں منشی پریم چند کا ناول پڑھ رہی تھیں۔ اس کا نام تو یاد نہیں رہا۔ ہیروئن کا نام 'کسم' تھا نانا نے دیکھ لیا تو ایک چانٹا لگایا۔ ان کی امی بعض رسالے اور کتابیں ان سے چھپا کر رکھتی تھیں۔ ایک بار انہوں نے ان کے بکس میں ایک رسالہ دیکھا۔ اس میں اشفاق احمد کی کہانی ''مہمانِ بہار'' تھی۔ پڑھ کر آنسو بھی بہائے سمجھ میں تو خاک آئی ہوگی۔ ہیرو کا غالباً نام اختر تھا اس کی موت نے انہیں رلایا۔ یہ کہانی چھپ کر پڑھی تھی۔

ان کے ابا کا ٹرانسفر ہوگیا۔ انہیں کلیم میں ایک گھر محلّہ واٹر ورکس میں مل گیا۔ ان کے گھر کے سامنے جناب عبدالرشید قریشی صاحب کا گھر تھا۔ وہ ایک رسالہ ''نظام تعلیم'' نکالتے تھے۔ اس میں ان کی کہانی ''ننھا مجاہد'' چھپی عمر نو سال کی تھی۔ ان کے اکسانے پر اور بھی کہانیاں لکھیں اس کے علاوہ کبھی کبھار ''ہدایت'' اور اکثر ''پھول'' میں بھی لکھنا شروع کر دیا۔ یہ سب بچگانہ کہانیاں تھیں۔ ان کے مطالعہ کا شوق جاری رہا۔ سیالکوٹ کی اقبال لائبریری سے کتابیں منگوا کر پڑھا کرتیں۔ پیسے جمع کر کے چھوٹی چھوٹی کتابیں خریدتیں۔ ایک لائبریری بھی بنائی ''یاسمین لائبریری''۔ محلے کے کسی لڑکے نے چرا کر ان کی ساری کتابیں ردی میں بیچ ڈالیں۔ کئی دن وہ روتی رہیں۔

بہر حال گھر کا ماحول ادبی تھا۔ سارے مشہور ادبی پرچے آتے تھے۔ ان کی امی بھی لکھتی تھیں۔ نام سے تو بہت سے لوگ واقف ہی ہیں۔ مشہور مصنفہ نیر بانو صاحبہ۔ ان کی ابتدائی تربیت میں ان کی والدہ اور محترمہ حمیدہ بیگم صاحبہ کا ہاتھ ہے۔ حمید اللہ صاحب کے انتقال کے بعد وہ واپس اپنے میکے چلی گئیں۔ وہ جہاں بھی رہتیں۔ ان کی امی گرمیوں کی چھٹیوں میں انہیں ان کے پاس بھیج دیتی تھیں۔ جہاں وہ انہیں مولانا کی کتابیں سناتیں۔ ریاض الصالحین میں سے حدیثیں سناتیں۔ انہیں معلوم تھا کہ لڑکیاں خشک اور سنجیدہ کتابوں کی طرف نہیں آتیں۔ انہیں ناول اور افسانہ زیادہ دلچسپ لگتا ہے تو پھر یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا کہ کسی طرح ان تک مقصدی لٹریچر بھی پہنچے۔

طبیعت میں شوخی تھی۔ ہنسنا ہنسانا محفلیں جمانا پسند تھا۔ شاید اسی وجہ سے مزاح لکھنا ان کے لئے

آسان ہوگیا۔ان ہی دنوں خواتین نے ''عفت'' رسالے کا اجراء کیا۔اور انہوں نے چودہ سال کی عمر میں پہلا افسانہ ''منزل'' لکھا۔جو عفت میں چھپ گیا۔بس پھر لکھنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔والدہ اور خالہ بیگم (حمیدہ بیگم مرحومہ) کی حوصلہ افزائی تھی ورنہ ان کا کہنا ہے کہ من آنم کہ من دانم۔

ان کی جیسے زبان کچر کچر چلتی تھی اسی طرح قلم بھی چلتا تھا۔مزاج میں تیزی اور سر پھرا پن بھی تھا۔ کسی پر غصہ آیا اور قلم پکڑ کر اس کی ایسی کی تیسی کر دی۔بقول ان کی ''اما غنچے لانا ذرا میرا قلم دان'' تو حمیدہ بیگم صاحبہ کہتیں ہاں ذرا لکھو تو اس پر اور سناؤ تو میں فوراً اپنے قلم کے جوہر دکھاتی۔ان کی ماں اور وہ مزے لے لے کر سنتیں اور آخر میں کہا جاتا۔بس اب اسے پھاڑ دو۔صرف ایک مضمون ''منٹو.....ایک عظیم فنکار'' چراغ راہ میں جانے دیا۔کیونکہ اس نے ''گنجے فرشتے'' میں ان کی والدہ کے خلاف ہرزہ سرائی کی تھی۔ لطف تو یہ ہے کہ انہوں نے منٹو کو پڑھا ہی نہیں تھا۔ان کی والدہ کی طرف سے اجازت ہی نہیں تھی۔اور عمر بھی یہی پندرہ سولہ سال ہوگی۔صرف لوگوں کے تنقیدی مضامین کی مدد سے وہ مضمون لکھا تھا۔

بقول سلمیٰ یاسمین نجمی:

ایک بار والدہ ہفتہ بھر کے لئے کراچی یا لاہور گئیں تو ابا کہنے لگے ''تو نے فسانہ آزاد پڑھی ہے؟''

''نہیں ابا۔''

''تو پھر تو نے کیا خاک پڑھا ہے۔فوراً پڑھ ڈال اس سے پہلے کہ تیری ماں واپس لوٹ آئے۔وہ پڑھنے نہیں دے گی۔''

ابا بے چاروں نے اپنی زندگی میں شاید فسانہ آزاد، طلسم ہوشربا اور الف لیلیٰ کے سوا چوتھی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی۔اقبال لائبریری سے فسانہ آزاد کی چار جلدیں آگئیں۔کئی ہزار صفحات پر مشتمل بھاری بھرکم چوڑی چکلی کتابیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیسے ختم ہوں گی۔بہر حال وہ جت گئی اور امی کے لوٹنے سے پہلے چاروں جلدیں ختم کر کے دم لیا۔''

خواتین کا مشہور رسالہ ''عفت'' کے بعد ''بتول'' نکل آیا۔لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔کالج میگزین میں بھی انکی کہانیاں چھپ جاتی تھیں۔کراچی سے پنجابی سوداگران کا رسالہ ''سوداگر'' نکلتا تھا۔اس میں کئی

کہانیاں چھپیں۔ چراغ راہ میں بھی چند کہانیاں شائع ہوئیں۔

وہ کالج میں آئیں تو انگریزی لٹریچر سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اچھا لکھنے کے لئے دنیا کے مشہور ادیبوں کو پڑھنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر فن میں نکھار پیدا نہیں ہوسکتا۔

وہ تھرڈ ایئر میں تھیں کہ منگنی ہوگئی۔ خواجہ محبوب الٰہی صاحب، م الف خواجہ کے نام سے "ایشیا" میں "مکتوب لندن" لکھتے تھے۔ مشرقی پاکستان میں جمعیت کے پہلے ناظم تھے۔ تعلق پنجاب کے ضلع جہلم کے شہر یا قصبے پنڈ دادخان سے تھا۔ مگر زندگی بہار اور بنگال میں گذری۔ سلمٰی یاسمین نجمی کی اپنی کالج کی زندگی بہت ہی بھرپور تھی۔ ہر چیز میں حصہ لیا سوائے ڈراموں کے۔ بیسٹ ڈبیٹر، بیسٹ افسانہ نگار کا ایوارڈ ملا۔ ادبی یونین کی پریذیڈنٹ تھیں۔ انٹر کولجیٹ ڈبیٹس کے لئے کئی دفعہ اپنے شہر سے باہر بھی گئیں۔ بی اے کا امتحان دیتے ہی شادی ہوگئی۔ رزلٹ بعد میں ملا۔ شادی کے بعد وہ خواجہ صاحب کے ساتھ لندن چلی گئیں جہاں یہ سی اے کر رہے تھے اور اسلامک سینٹر ریجنٹ اسٹریٹ کے پریذیڈنٹ بھی تھے۔ گھریلو زندگی کی مصروفیات کی وجہ سے لکھنا کم ہوگیا۔ کہاں تو ہر ماہ تحریر چھپتی تھی اور کہاں دو سال کے قیام کے دوران شاید چار یا پانچ کہانیاں لکھی گئیں۔

1963ء نومبر میں وہ لوگ اپنے منے سے بیٹے کے ساتھ واپس لوٹ آئے اور پہلا قیام ان کا کراچی میں ہوا۔ مطالعہ کا تو نہیں البتہ لکھنے کا سلسلہ ذرا سست پڑ گیا تھا۔ کراچی کے بعد دو سال چٹاگانگ میں رہے اور نومبر 1967ء میں وہ کینٹ آگئے۔ یہ حسن ابدال میں شیشے کی فیکٹری سنبھال رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد وہ بہت بیمار پڑ گئیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے لاہور لے چلیں۔ میں خالہ بیگم کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ ہوسکتا ہے زندگی کے دن تھوڑے ہوں۔ میں ان کے پاس گذارنا چاہتی ہوں۔ یوں وہ لوگ لاہور شفٹ ہوگئے۔ اب وہ تھیں اور خالہ بیگم۔ ایک قسم کی ان کی زندگی کی نشاۃ ثانیہ کا دور تھا۔ خالہ بیگم بہت بیمار رہتی تھیں۔ پیٹ میں پانی بھر جاتا تھا جو وقتاً فوقتاً نکالا جاتا تھا۔ اوپن ہارٹ سرجری ہوچکی تھی وہ کیا کہا ہے انیس نے کہ۔

انیس دم کا بھروسہ نہیں ذرا ٹھہر جاؤ

چراغ لے کر کہاں سامنے ہوا کے چلے

بہر حال چراغ تو اب ہوا کی زد میں تھا۔ جانے کب گل ہو جاتا۔ بقول سلمیٰ یاسمین نجمی۔ انہوں نے نومبر 1972ء میں ''بتول'' کی ادارت سنبھالنے کے لئے کہا۔ بقول سلمیٰ

''اتنی بڑی ذمہ داری کے لئے جو خصوصیات ہونی چاہئیں، وہ ناپید۔ نہ علم، نہ تجربہ، نہ پختگی، نہ عمر، میں نے بہت انکار کیا۔ معذرتیں پیش کیں مگر انہوں نے ایک نہ سنی''۔

یوں یہ بھاری پتھر انہیں چومنا پڑا۔ سلمیٰ ''بتول'' میں خبر و نظر کا کالم لکھتی تھیں۔ جو جاری رہا۔ اب حرفِ اول بھی ان کے ذمے ہو گیا۔ جو اب تک لکھ رہی ہیں۔ وہ نگران تھیں۔ خالہ بیگم کے زیر سایہ یہ رسالہ مرتب کر رہی تھیں۔ 17 ستمبر 1973 میں ان کا انتقال ہو گیا تو محترمہ نیر بانو صاحبہ نگران مقرر ہوئیں۔ اب انہیں ان کی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی۔ اور سب سے پہلا نمبر جو نکالا تو وہ حمیدہ بیگم نمبر ہی تھا۔ بعد میں اس نمبر سے استفادہ کر کے جناب پروفیسر فروغ احمد صاحب اور ڈاکٹر عبد الغنی فاروق صاحب نے محترمہ پر دو کتابیں بھی مرتب کیں ایک کا نام ''اوصافِ حمیدہ'' تھا دوسری کا نام ان کو یاد نہیں رہا۔ مئی 1974ء میں انہوں نے لاہور چھوڑ دیا۔ اور پنڈی سے ہی رسالہ مرتب کرنا شروع کر دیا۔ جو لاہور میں چھپ کر وہیں سے تقسیم ہوتا تھا۔

انہوں نے مختلف شخصیات کے انٹرویو لینے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ چند اہم خواتین کے انٹرویو کیے۔ مثلاً عابدہ گرمانی، رضیہ راشد علی، بیگم مودودیؒ، بلقیس صوفی، ام زبیر اور ڈاکٹر کوثر فردوس صاحبہ۔ وغیرہ

پروفیسر فروغ احمد صاحب ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ''بتول'' پر سیر حاصل تبصرہ کرتے اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے۔

سلمیٰ کی ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ ہر سال ایک خاص نمبر ضرور پیش کیا جائے۔ پہلا سالنامہ انہوں نے (1) دسمبر 1974ء میں پیش کیا۔ دوسرا (2) سالنامہ جنوری فروری 1976ء میں آیا۔ (3) اگست میں آزادی نمبر اور پھر فوراً ہی (4) قائداعظم نمبر دسمبر 1976ء میں نکالا۔ ان ہی دنوں انہوں نے مزاحیہ مضامین کا سلسلہ ''کوئے ملامت'' کے عنوان سے اردو پیج میں شروع کیا۔ جس کے ایڈیٹر سلطان

رشک کرنل محمد خان اور سید ضمیر جعفری جیسے نامور مزاح نگار تھے۔ایک مضمون میں سلمیٰ نے لکھا کہ ''تحریکی لڑکیاں کدھر جائیں''اس پر خوب بحث مباحثے ہوئے۔آخر تحریکی رشتے کرانے کی ذمہ داری بھی ان پر ڈال دی گئی۔یہ ایک الگ کہانی ہے۔نیر بانو صاحبہ کی بجائے محترمہ بنت اسلام صاحبہ کو مجلس ادارت میں شامل کرلیا گیا۔ بقول سلمیٰ یاسمین نجمی:

> ''مئی جون 1977 میں سالنامہ مرتب کیا۔نومبر دسمبر 1977 میں اقبال نمبر نکالا۔ سالنامے تو نکل ہی رہے تھے اب میں صرف خاص نمبروں کا ذکر کروں گی۔بتول میں میرا ڈرامہ ''اندھیر نگری، چوپٹ راج'' قسط وار آرہا تھا۔ادھر ''چلمن'' میں میرا پہلا ناول 'بوئے گل' قسط وار شائع ہونے لگا۔جولائی 1981ء سے میرا پہلا سفرنامہ ''قریہ بہ قریہ کو بہ کو'' قسط وار شروع ہوا۔میرا دوسرا سفرنامہ ''منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی'' قسط وار شائع ہوا۔یہ ابھی تک کتابی شکل میں نہیں آسکے''۔

سلمیٰ کی زیر ادارت خاص نمبروں کی دیگر تفصیلات: (5) سالانہ اجتماع نمبر۔جولائی 1979ء (6) سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نمبر۔ستمبر 1980ء (7) سالنامہ۔اگست 1980ء (8) سالنامہ۔جنوری فروری 1982ء (9) سالنامہ۔جنوری فروری 1984ء (10) سالنامہ۔جنوری فروری 1986ء (11) جہاد نمبر۔دسمبر 1986ء (12) سیرت نمبر۔نومبر 1987ء (13) بنت الاسلام نمبر۔جون جولائی 1990ء (14) افسانہ نمبر۔جنوری 1995ء (15) پاکستان نمبر۔اگست 1996ء (16) سالنامہ۔فروری 1998ء (17) ام زبیر نمبر۔جنوری 2000ء۔

یہ ان کی ادارت کا آخری نمبر تھا۔مئی 2000 سے بتول کی ادارت کا عرصہ ختم ہوا۔محترمہ نیر بانو صاحبہ کی نگرانی میں ''حریم ادب'' کی بنیاد رکھی گئی۔جس کی پہلی صدر سلمیٰ تھیں۔کئی شہروں میں اس کی شاخیں کھولی گئیں۔یوں انہیں بہت سے اچھے ادیب اور عمدہ نگارشات ملیں۔

اکتوبر 2000 سے انکی ادارت کا دوسرا دور ماہنامہ ''عفت'' سے شروع ہوا۔سب سے پہلا نمبر انہوں نے حیا نمبر (1) نکالا۔اکتوبر 2001ء اس کے بعد حیا نمبر (2)۔مئی 2002ء، سالنامہ۔جنوری

2003ء، نعیم صدیقی نمبر۔ اکتوبر 2004ء، دوقومی نظریہ نمبر (2)۔ اگست 2005ء، دوقومی نظریہ نمبر (2)۔ اگست 2006ء، حیا نمبر (3) نومبر 2006ء، سالنامہ۔ جولائی 2007ء، خاص نمبر۔ جولائی 2007ء، سالنامہ۔ ستمبر 2009ء، پاکستان نمبر۔ اگست 2010ء، سالنامہ۔ اکتوبر 2011ء۔

عفت میں ''نوائے سحر'' کے نام سے سلمٰی نے علامہ اقبال کے کلام کی تشریح شروع کی جو بعد میں کتابی صورت میں آ گئی۔ ''نوائے سحر'' کے نام سے۔ اگست 2008ء میں تیسرا سفرنامہ ''قید مقام سے گذر'' شروع کیا گیا حسب معمول قسط وار۔ یہ تو ان کی ادارت کی کہانی ہے۔

راولپنڈی آنے کے بعد انہوں نے اپنا پہلا ناول ''بوئے گل'' لکھنا شروع کیا جو ماہنامہ ''چلمن'' لاہور میں قسط وار چھپا۔ بعد میں چلمن نے ہی اس کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ لڑکیوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس کے تین ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ دوسرا ایڈیشن فضل من اللہ صاحب مدیر ''سیارہ'' نے چھاپا تھا۔

''اردو ہنج'' فکاہیہ رسالہ سلطان رشک، سید ضمیر جعفری اور کرنل محمد خان کے زیر ادارت چھپتا تھا اس میں ان کے مزاحیہ مضامین اور کہانیاں چھپتی رہیں۔ جو انہوں نے ہی 1991ء میں کتابی صورت میں شائع کیں۔ اس کا دوسرا ایڈیشن 2003ء میں شائع ہوا۔ دو ناولٹ ''ہم نفس'' اور ''کرن آرزو کی'' 1994ء میں کتابی صورت میں چھپے۔ ''گھر سے کالج تک'' ان کی ابتدائی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ 1992ء میں شائع ہوا۔ اس میں 1955ء سے لے کر 1959ء تک کی کہانیاں ہیں۔ دوسرا مجموعہ ''چوتھا کھونٹ'' 1996ء میں شائع ہوا۔ اس میں 1975 تک افسانے ہیں۔ ''نوائے سحر'' 2008ء میں شائع ہوئی اور پھر ناول ''سانجھ بھئی چودیس'' 2009ء میں شائع ہوا۔ جو کتابیں مرتب کیں: (1) سوانح عمری بنت الاسلام صاحبہ (2) سوانح عمری محترمہ نیر بانو صاحبہ نام ''چراغوں کا دھواں'' (3) ''سانول موڑ مہار'' محترمہ نیر بانو کے دو ناولٹس کا مجموعہ (4) آفتاب نو'' الماس مہکری صاحبہ کا کلام (5) سمیعہ سالم کے افسانوں کا مجموعہ ''شام فراق''۔

ان کی تین تقاریر پمفلٹس کی صورت میں شائع کی گئیں (2) ''حرمت قرآن'' (2) ''حرمت رسولؐ'' (3) ''کیا ہم ایک ہیں؟'' ان کے کئی کئی ایڈیشن کئی کئی ہزار کی تعداد میں شائع ہوئے۔ یہ ہے ان کی

ادبی زندگی کی کہانی۔

اسلامی موضوعات پر مضامین کی اتنی تعداد ہے کہ اس کو لکھنا ان کے لئے مشکل ہے۔اقبالیات ہی پر ان کے کئی لیکچر ''الہدیٰ'' میں ہوئے۔

ان کا فنی نقطہ نظر ادب برائے زندگی اور زندگی برائے بندگی ہے۔''بوئے گل'' کے بارے میں خاصی معرکہ آرائی ہوئی۔بعض دینی خواتین کو اس میں فحاشی نظر آئی۔لہٰذا ان کے حلقوں میں اسے بین کر دیا گیا۔اور اس کا ذکر بھی ''بتول'' میں ممنوع قرار دیا گیا البتہ اسلامی ادب کے ناقدین نے پسند کیا۔ان کے حلقے سے باہر کے لوگوں نے اس کی ''پارسائی'' کو غیر فطری قرار دیا۔''سانجھ بھئی چودیس'' کو بہت زیادہ پذیرائی ملی ہے۔

بقول ان کے کون سی وراثت اور کیسی وراثت۔وراثت تو مال ومتاع کی ہوتی ہے۔فقیر کی گدڑی کی کیا وراثت۔بقول سلمیٰ یاسمین نجمی:

> ''شاگرد تو میں نہیں کہہ سکتی مگر میری ادارت کے زمانے
> میں بہت سے لکھنے والوں کی جو حوصلہ افزائی کی تو ذرہ
> نوازی کے طور پر وہ مجھ ناچیز کو کریڈٹ دیتے ہیں۔اللہ
> ان کو خوش رکھے۔کسی میں صلاحیت ہو تو وہ اپنی جگہ
> بناتا ہے۔محض حوصلہ افزائی سے کیا ہوتا ہے۔''

انہیں اپنی کتاب ''سانجھ بھئی چودیس'' بہت پسند ہے۔اس کو انہوں نے پانچ بار لکھا۔یہ پچیس سالوں میں مکمل ہوئی۔ان کا خیال ہے یہ ایک اچھی کتاب ہے۔بطور مصنف نہیں بحیثیت قاری کے یہ ان کی رائے ہے۔وہ اپنی تخلیقات کو قاری کے طور پر پڑھ کر بھی اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتی ہیں۔اور کڑی تنقید بھی کرتی ہیں۔اس کو پڑھ کر وہ روئی بھی ہیں اور انہیں مصنفہ پر غصہ بھی آیا تھا کہ اس کا یہ دردناک انجام کیوں کیا۔مگر بے چاری مصنفہ کا بھی کیا قصور۔وہ تو اپنے کرداروں کے پیچھے قلم لے کر دوڑتی رہتی ہیں۔وہ جو بولتے ہیں وہ لکھتی ہیں۔جو کرتے ہیں وہ دکھاتی ہیں۔جو منطقی انجام ہوتا ہے وہ ہی پیش کر دیتی ہیں۔وہ

بے چاری تو مجبور ہیں ۔اصل کہانی وہ نہیں اس کے کردار لکھتے ہیں۔

بقول راقمہ علمی ادبی شخصیات جن سے وہ متاثر ہوئیں ۔یا جنہوں نے انکی زندگی پر اثرات چھوڑے۔ان میں سب سے بڑی اہم شخصیت تو سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کی ہے۔وہ انہیں اور علامہ اقبالؒ کو اپنا مرشد سمجھتی ہوں ۔مولانا کے بارے میں انکا مضمون ''ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم'' کئی رسالوں میں چھپ چکا ہے۔باقی جنہوں نے انکی حوصلہ افزائی کی،مشورے دیئے، ساتھ دیا۔ وہ ہیں نعیم صدیقی صاحب ،پروفیسر فروغ احمد صاحب ،اسرار احمد سہاوری صاحب، لالۂ صحرائی صاحب، حفیظ الرحمٰن احسن صاحب ،سید اسعد گیلانی صاحب اور سب سے اہم جناب سید قاسم محمود صاحب (جن کا وہ مشہور افسانہ ہے قاسم کی مہندی اور خود نوشت دھوپ چھاؤں ،اسلامی انسائیکلوپیڈیا ان کا بڑا کارنامہ ہے) ۔انہوں نے ہی سانجھ شائع کی ۔اور بقول ان کے وہ جسے اچھا سمجھتے ہیں اسی کو شائع کرتے ہیں ۔اس معاملے میں کسی کا لحاظ نہیں کرتے۔

❁❁❁

اردو ادب پر تحریکات اسلامی کا اثر

جناب غلام محمد

ہندوستان میں مسلمانوں کے آمد کی ابتدا محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے خیال کی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ شمالی ہند سے پہلے جنوبی ہند میں مسلمانوں کی نوآبادیاں قائم ہوئی اور سب سے پہلے تاجرانہ حیثیت سے جنوبی ہند میں آکر آباد ہوئے۔ ''ہندوستانی تہذیب پر اسلام کا اثر'' میں ڈاکٹر تاراچند نے لکھا ہے کہ

> ''ظہور اسلام کے تھوڑے ہی دنوں بعد مسلمانوں نے ہندوستان میں اپنی تہذیب، مذہب اور خیالات کو پھیلانے کا موقع حاصل کیا۔ ساتویں صدی سے تیرہویں صدی تک ان کا تعلق تجارت کی صورت میں تھا..... یہاں ان کو اپنے مذہب کی پابندی کے لیے مسجدیں بنانے اور اپنے مذہبی پیشواؤں اور صوفیوں کو خانقاہوں میں رکھنے کی اجازت تھی ہی نہیں بلکہ وہ اپنی مذہب کی تبلیغ کر سکتے تھے۔ اور کہیں کہیں تو راجہ خود اس تبلیغ میں مدد کرتے تھے۔ یہ صرف جنوبی ہند تک محدود نہیں تھے۔ بلکہ شمالی ہندوستان میں بھی مسلمانوں کا ہندوؤں سے بہت دنوں تک اسی طرح کا تعلق رہا۔ یہ سچ ہے کہ آٹھویں صدی کے اوائل میں عربوں نے سندھ پر قبضہ کرلیا۔ لیکن ملتان اور سندھ کو چھوڑ کر اور کوئی حصہ ۳۳۰ برس تک ان کے قبضے میں نہ رہا۔''

مسلمانوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا۔ جنوبی ہند میں آمد تاجرانہ تھی، تو شمالی ہند میں فاتحانہ طریقہ سے آئے۔ فاتح اور مفتوح کے تعلقات تھوڑے دنوں رہے، بعد میں ہندو مسلمان ہمسایہ کی طرح رہنے لگے۔ ایک جگہ مشترکہ طور پر رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دوسرے کے تہذیب و تمدن سے متاثر ہوئے اور اس طرح ایک نئی تہذیب وجود میں آئی جس کو ہندوستانی تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ جو نہ خالص اسلامی تھی اور نہ بالکل ہندو۔ ایسی ہی تبدیلی ادب کے میدان میں بھی نظر آتی ہے۔ ہندوستان کا علمی سرمایہ عوام کی ضروریات کے لیے سنسکرت سے منتقل ہوکر گجراتی، مرہٹی، ہندی اور بنگالی میں آجاتا ہے۔ اور مسلمان اپنی عربی، فارسی اور ترکی

چھوڑ کر اس ملک کے باشندوں کی زبان اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح ایک نئی زبان وجود میں آتی ہے۔ یہ زبان ہندو مسلمان کے میل جول کا نتیجہ تھی۔ مسلمان جس صوبے میں بھی گئے وہاں کی زبان اختیار کر کے مذہبی، سیاسی، تمدنی، صنعتی، تجارتی اور عملی ضرورتوں سے اپنی زبان کے سیکڑوں الفاظ اس میں داخل کر دیے اور چونکہ یہ الفاظ ان کی ضرورت کی بنا پر تھے اس لیے زبان کا جز بن گئے۔ اس طرح ایک مخلوط زبان کا پیکر تیار ہوا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی تحقیقی مقالہ میں ان الفاظ کا ذکر کیا ہے کہ: یہ زبان گجرات میں گجراتی، دکن میں دکنی اور پنجاب میں پنجابی اور دہلی میں دہلوی۔ دہلی کی زبان ترقی کرتے کرتے شاہجہاں کے اردو معلی میں پہنچی تو زبان اردو کے نام سے مشہور ہوئی۔ شروع میں اس مشترکہ زبان کی تشکیل میں مسلمان درویشوں اور صوفیوں کا بڑا حصہ رہا ہے وہ مسلمان تاجروں اور سپاہیوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان آئے تھے اور ان کی فتوحات کا دائرہ سلاطین کی ملکی فتوحات سے کم نہ تھا۔ مولوی عبدالحق نے ''اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ'' میں ذکر کیا ہے۔ اور ان کی زبان کے نمونے نقل کئے ہیں یہ سب آٹھویں صدی سے لے کر گیارہویں صدی ہجری تک کے ہیں۔ اس کے بعد مخلوط زبان عام ہوگئی اور اچھے اچھے شاعر پیدا کیے۔ دکن میں اردو کی اتنی ترقی ہوئی کہ وہاں سولہویں اور سترہویں صدی میں ہم کو سیکڑوں شاعر اور کتابوں کے نام ملتے ہیں محمد قلی قطب شاہ جس نے حیدرآباد کو شہر بنایا اردو کا بہت بڑا شاعر تھا۔ اس نے اردو میں پچاس ہزار سے زیادہ شعر کہے۔ یہ اسی کا زمانہ ہے جو اتری بھارت میں اکبر بادشاہ کا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے بعد اس خاندان میں تین اور بادشاہ ہوئے وہ سب بھی شاعر تھے۔ جب بادشاہوں نے اس بول چال کی زبان میں دلچسپی لی تو پھر عوام کا کیا کہنا۔ بہت سے شاعر پیدا ہوئے، مذہبی رنگ کے لکھنے والے بھی، قصہ کہانی کہنے والے بھی۔ کہانی سے شاعری تک اردو کا زمانہ تین سو سال تک رہا۔ اس زمانے میں ۱۷۵۰ء کے بعد دہلی میں بڑے بڑے شاعر پیدا ہوئے۔ خواجہ میر درد سے انعام اللہ یقین وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی میں انگریزوں کی جیت ہوئی۔ ان کے حوصلے بڑھے تھوڑے دنوں بعد انہوں نے دہلی کے بادشاہ شاہ عالم کو الہ آباد میں بند کر دیا اور وظیفہ دینے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف صوبوں میں نئی حکومتیں قائم ہونے لگی تھیں۔ انہی حکومتوں میں ایک اودھ کی حکومت بنی جس کے پہلے فرماں روا نواب شجاع الدولہ تھے۔ انہوں نے دلی سے شاعروں، کاریگروں اور دیگر

لوگوں کو بلا کر آباد کیا۔جس سے رونق بڑھی ۔جب دلی کی بہار لٹی تو اودھ میں نئی بساط جمی اور تھوڑے ہی دنوں کے اندر وہاں کے در و دیوار سے شعر کی آواز آنے لگی۔لکھنؤ کا اپنا ایک طرز شاعری بن گیا۔جسے عام طور پر لکھنؤ اسکول یا دبستان کہتے ہیں۔

اردو میں نثر کی ترقی کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ نثر میں دکن میں بندہ نواز گیسو دراز نے معراج العاشقین کے نام سے تصوف کے بارے میں ایک رسالہ لکھا تھا۔یہ چھوٹا سا رسالہ دکنی اردو نثر کا پہلا نمونہ ہے۔اسی طرح سے سید مخدوم اشرف جہانگیر کچھوچھوی نے ایک مذہبی رسالہ نثر میں لکھا۔'سب رس' میں بھی اخلاقی اور صوفیانہ رنگ کی کہانی ہے۔اس کے لکھنے کا زمانہ ۱۶۳۵ء ہے۔ اٹھارہویں صدی میں سید محمد قادری نے ''طوطی نامہ'' نام سے ایک کتاب لکھی جس میں پرانے ہندوستان کی اخلاقی کہانیاں ہیں۔لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ نثر میں پہلے جو بھی کتابیں لکھی گئیں وہ سب کی سب اخلاقیات پر مبنی تھیں۔ ۱۷۵۷ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک اردو نثر میں ہر طرح کے مضامین لکھے گئے۔اسی دور میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ ملا۔۱۸۳۵ء پر پریس قائم ہوا، کتابیں چھپیں، اخبار نکلنے لگے۔اس طرح نثر کے اندر زبردست تبدیلی آئی۔لیکن حقیقت میں نثر میں ترقی ۱۸۵۷ء کے بعد ہوئی۔ جب ہندوستان میں ایک زبردست انقلاب آیا۔۱۸۵۷ء کے بعد کے آخری حصے سے اردو ادب کا نیا دور پھر سے شروع ہوتا ہے۔اسی دور میں نثر میں نئی اصناف ادب کا داخلہ ہوتا ہے۔ناول، نئے انداز کی سوانح نگاری، تنقید، مضمون نگاری، تاریخ وغیرہ کی ابتدا اسی زمانے سے ہوتی ہے۔سرسید، حالی، آزاد، ذکا اللہ، نذیر احمد، شبلی اور اکبر کے ہاتھوں اردو ادب کی دنیا بدلتی نظر آتی ہے۔ان میں ہر ایک کا زمانہ بے حد اہم اور اردو خزانے کے لیے بہت قیمتی ہے۔ حالی، آزاد، شبلی اور اکبر کے نظم لکھنے کا سلسلہ جو چلا تو ایک غیر معمولی شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کو جنم دیا۔جنہوں نے فلسفہ اور شاعری رنگینی اور سنجیدگی کو اس طرح ملایا کہ شاعری جادو بن گئی۔انہوں نے انسانوں کی عظمت کے گیت گائے۔اور شاعر مشرق کہلائے۔اسی زمانے میں سب سے زیادہ علمی و ادبی مسائل کی طرف نگاہ گئی اور تحقیقی کام کی لگن لوگوں میں پیدا ہوئی۔مولانا عبدالحق، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سعید اکبر آبادی، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا

عبدالباری، شاہ معین الدین ندوی، ریاست علی ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، صباح الدین عبدالرحمن، نجیب اشرف ندوی کے نام بھی ایسے ہیں جنہیں تاریخ ادب کبھی بھلا نہیں سکتی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آج اردو زندہ ہے انہیں اسلامی مفکروں کی وجہ سے جنہوں نے نہ صرف مدارس قائم کئے، ادارے بنائے بلکہ اردو ادب کے اندر اتنا ذخیرہ جمع کر دیا کہ عربی کے بعد اگر اسلامی معلومات کا خزانہ کسی زبان میں ہے تو وہ اردو ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی زبان اس وقت کے لوگوں کی دھڑکن نہیں بن سکتی جب تک اس کے اندر اپنی تہذیب و تمدن کا ذخیرہ موجود نہ ہو۔ آخر میں ادب کے اندر خانہ بندی پر ایک مفکر کی اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔

''سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ادب کے نقادوں نے اردو کی علمی نثر سے بحیثیت مجموعی بے التفاتی برتی ہے۔ خیر نثر کی ان اصناف کو بھی ادب میں شامل کیا ہے جن کا تعلق، افسانہ، ناول، ڈرامہ، انشائیہ اور طنز و مزاح سے ہے۔ لیکن مکالمہ اور سنجیدہ علمی مضامین کو (محدود ادبی تنقیدی مقالات کو چھوڑ کر) شعوری یا غیر شعوری طور پر ادب سے خارج تصور کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیت مجموعی سنجیدہ علمی نثر کو ادب کے زمرے میں شامل ہی نہیں کیا گیا اور کیا گیا ہے تو محض وزن و بیت کے لیے۔ اگر دنیا کے دوسرے ادبی حلقوں میں بھی اسی تنگ نظری اور یک رخے پن کا اظہار کیا جاتا تو علم و ادب پورے ادبی ورثہ کے تقریباً ایک تہائی سے محروم ہو جاتا۔ افلاطون اور ارسطو کی معدودے چند تصنیفات کو چھوڑ کر سب بزم ادب سے نکال دی جاتی، کارلائل، رسکن، جان اسٹوارٹ مل، کارل مارکس اور فریڈرک اینجلز کا شمار ادیبوں میں نہیں ہوتا۔ بیسویں صدی کے ادب میں برناڈ شا کے ڈراموں کو شامل کیا جاتا مگر اس کے شہرہ آفاق مقدمات کو نہیں۔ جو اس کی کل تحریرات کا تقریباً ایک چوتھائی ہے اور جن کا موضوع اس دور میں معاشی، تمدنی اور فلسفیانہ مباحث ہیں۔ اسکاروائلڈ، ڈی۔ ایچ لارنس، جارج آرول اور ٹی۔ ایس ایلیٹ کے بے شمار مقالات ایوان ادب میں قدم رکھنے کے لائق نہ

رہتے۔ برٹرینڈ رسل اور ونسٹن چرچل جیسے اہل قلم کو تو ادیب ہی تصور نہ کیا جاتا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس ادبی مقاطعہ (Literacy Ex-communication) کی زد سے بہت کم ہی لوگ بچ سکتے۔ (پروفیسر خورشید احمد۔ ادبیات مودودی)

چلے جانب مے خانہ خودکشی کے لیے　　غم حیات سے ہارے ہوئے یہ دیوانے

(ماہر القادری)

❁❁❁❁❁

اردو رباعیات کا فن اور اخلاقیات

جناب ظہیر غازی پوری

اردو ادب کے باذوق قارئین اور بالغ نظر تخلیق کار اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ بیشتر اصناف شاعری فارسی اور عربی زبان سے اردو زبان میں منتقل ہوئی ہیں۔ان میں سے غزل،نظم،مثنوی، رباعی، مرثیہ اور قصیدہ نسبتاً زیادہ مروج اور مقبول رہے ہیں۔متقدمین نے قصائد،مراثی اور مثنویاں تواتر سے لکھیں۔ فی زمانہ انہیں فراموش شدہ اصناف سخن میں شمار کیا جانے لگا ہے۔غزلیں،نظمیں اور رباعیاں تقریباً ہر عہد میں عوام وخواص کی پسندیدہ اصناف شاعری رہی ہیں۔بیسویں صدی کے اوائل میں رسالہ ''مخزن'' اور ''ہمایوں'' کے مدیران نے جدید نظم نگاری کے لیے نہ صرف راہیں ہموار کیں بلکہ غزل بیزار تحریک بھی شدومد سے چلائی۔ اس عہد سے عصر حاضر تک اصناف نظم وغزل پر بے شمار تنقیدی،تحقیقی اور تخلیقی مجموعے اور صحیفے قلم بند کئے جاتے رہے ہیں۔صنف رباعی جیسا کہ مذکور ہوا کم وبیش تمام ادوار میں اپنی توانائی اور رعنائی کے ساتھ زندہ و تابندہ رہی ہے۔گزشتہ تین چار دہائیوں میں ہم عصر شعرا نے رباعی گوئی کی جانب خصوصی توجہ دی ہے تو یہ رسائل و جرائد کی زیب و زینت بھی بڑھانے لگی ہے اور متواتر رباعیوں پر مشتمل مجموعے نیز کتابیں اور ادبی رسائل کے خصوصی نمبر بھی بصد اہتمام شائع ہونے لگے ہیں۔لہذا پورے وثوق سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ فکری اور فنی لحاظ سے رباعی دل خواستہ،ممتاز اور ہر دلعزیز شعری صنف ہے جو پورے جلال و جمال کے ساتھ ہر راہ دشوار میں قدم زن ہے۔

میں اردو رباعیات کے فن اور اخلاقیات کے موضوع پر مختصراً گفتگو کروں گا۔مختصراً اس لیے کہ یہ موضوع ایک طویل مضمون اور معروضی بحث وتمحیص کا متقاضی ہے۔صنف رباعی کی اپنی مخصوص ہیئت، فارم اور ساخت ہے جو چوبیس مقررہ اوزان کے رنگا رنگ لباس میں جلوہ ریز نظر آتی ہے۔ان ۲۴ اوزان میں سے ۸۔۱۰ اوزان ہی اپنی روانی اور آبشاری کیفیات کے باعث شعرا میں سکۂ رائج الوقت کی طرح مقبول اور پسندیدہ رہے ہیں۔باقی اوزان عموماً عروضیاتی ہنرمندی،فنی مہارت اور خلاقانہ رعب داب کے لیے استعمال

ہوئے ہیں۔رباعی کے ۲۴ اوزان کو دو خانوں ''شجرۂ اخرب'' اور ''شجرۂ اخرم'' میں تقسیم کیا گیا ہے۔ان کی تفصیل ڈاکٹر عنوان چشتی نے ''عروضی وفنی مسائل'' میں اور علیم صبا نویدی نے ''جہان اردو رباعی'' میں پیش کی ہے۔ویسے رباعی کے موضوع پر بیشتر ادیبوں نے اپنے مضمون میں عروضی رنگ و روغن کے ساتھ شجرۂ اخرب و اخرم کی تفصیلات مع ارکان مندرج کی ہیں۔میں یہاں صرف اس جانب اشارہ کرنے کی سعادت حاصل کروں گا کہ معلوم نہیں کیوں بعض عروض دانوں کو رباعی کے چوبیس اوزان کم لگے جس کے باعث حضرت علام عشق آبادی نے بارہ نئے اوزان اور ان کے ایک شاگرد رشید زار علامی نے اٹھارہ نئے اوزان وضع کئے جنھیں شرف قبولیت تو ضرور حاصل ہوا لیکن تیس اوزان میں غالباً رباعیاں نہیں کہی گئیں جب کہ سابقہ ۲۴ اوزان میں متعدد شعرا نے رباعیاں تخلیق کی ہیں۔بعض عروضی فن کاروں نے رباعی کے ہزاروں اوزان دریافت کئے ہیں۔میں اس نوعیت کے تجربات کو اگر عروضی معرکہ آرائیاں یا ریاضی کرتب بازیاں قرار دوں تو کیا غلط ہوگا؟

رباعی چونکہ صوفیوں کی محفلوں میں بھی جادو جگاتی رہی ہے،شہنشاہوں کے درباروں میں مصاحبین کو بھی رجھاتی رہی ہے اور بزم موسیقی میں بھی اپنے اہتزاز اور جھنکار سے سامع کو مسحور کرتی رہی ہے تو گمان گزرتا ہے کہ غیر مروجہ اوزان میں سُر،تال اور الاپ کی ایسی خوبیاں موجود ہو سکتی ہیں جو موسیقانہ جذب و سرور کے اثرات مرتب کرتی ہوں۔ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے ایسی ہی ایک محفل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> ''ایک محفل میں امام غزالی بھی موجود تھے اور جب حقیقت رسی اور حق شناسی کے سلسلے میں کوئی رباعی پڑھی گئی جس میں سخن کی معنویت کی طرف اشارہ تھا تو امام غزالی نے اپنی زبان مبارک سے فرمایا: ''سخن سخن''!۔''

فن رباعی کو مشاہیر متقدمین نے بھی اور متاخرین نے بھی انتہائی مشکل صنف سخن قرار دیا ہے۔جوش ملیح آبادی کا قول ہے:

> ''رباعی کہنا بڑا مشکل فن ہے۔یہ وہ کم بخت صنف سخن ہے کہ بڑے بڑے بہادروں کو سپر انداختہ کر دیتی ہے اور یہ کافر صنف بڑے بڑوں کے بھی قابو میں اس وقت تک نہیں آتی جب تک کہ زمانے کی سرد و گرم ہوائیں شاعر کی حساس و مفکر زندگی کے تقریباً

چالیس پچاس ورق نہیں الٹ دیتی ہیں''۔(دیباچہ ''رباعیات محروم'')

جوشؔ کا یہ فرمان اس زمانے میں لکھا گیا تھا جب امجدؔ حیدرآبادی، آسی غازی پوری، فراقؔ، محرومؔ، سیمابؔ، یگانہ، رواںؔ، فانیؔ، وحشتؔ کلکتوی اور شاعرؔ لکھنوی جیسے بے شمار شعرا تیز رفتاری سے رباعی تخلیق کر رہے تھے اور ان میں سے کسی نے اس نازک صنف سخن کو مشکل ترین صنف کا تمغہ عطا نہیں کیا تھا۔

حیرت انگیز بات یہ بھی ہے کہ مندرجہ بالا شعرا سے قبل انیسؔ، دبیرؔ، غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، حالیؔ، اکبرؔ، امیرؔ، مینائی اور پیارے صاحب رشید جیسے باکمال شعرا رباعیاں اسی طرح کہتے رہے جس طرح دوسری اصناف شعر میں طبع آزمائی فطری انداز میں ہوا کرتی ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جوشؔ کی رائے سے متاثر ہو کر اکثر رائے دہندگان اپنے اپنے طور پر رباعی کے فن پر اس طرح کے ریمارکس لکھتے چلے گئے۔یہاں ضروری ہے کہ بعض آرا سے لطف اندوز ہوتے چلیں:

> ''رباعی اس اعتبار سے بڑی کافر صنف ہے کہ وہ چار مصرعوں میں ابتدا، ارتقا اور انتہا کا مطالعہ کرتی ہے۔ اس طرح شاعر چار مصرعوں میں کہانی نہیں ، داستان کہتا ہے''۔(سردار جعفریؔ۔دیباچہ ''رباعیاں''۔صفحہ ۱۳)
>
> ''رباعی ایسی کم بخت چیز ہے کہ جو سارا جوبن گھالے تو ایک پالک پالے کی طرح چالیس پچاس برس کی مشاقی کے بعد کہیں جا کر قابو میں آتی ہے''۔(''رعنائیاں''۔ برج لال رعناؔ)

مذکورہ اہل فن کے علاوہ ڈاکٹر طلحہٰ رضوی برقؔ نے تحریر کیا:''رباعی دوسری اصناف سخن سے نسبتاً زیادہ مشکل صنف ہے''۔پروفیسر یوسف تقی نے لکھا:''اردو کی شعری اصناف میں رباعی ایک جامد سانچے کی مشکل اور محدود ترین صنف سخن ہے''۔تلوک چند محرومؔ کا خیال ہے کہ:''رباعی لکھنے کے لیے کافی مشق سخن اور پختگی عمر کی ضرورت ہے''۔حبیب الرحمن شیروانی کی نظر میں ''اصناف سخن میں سب سے زیادہ مختصر رباعی ہے جو سب سے مشکل ہے''۔مخمورؔ سعیدی بھی یہی مانتے ہیں کہ:''رباعی شاعری کی بڑی مشکل صنف ہے''۔اور پروفیسر ستیہ پرکاش نے بھی اظہار خیال کیا ہے:''رباعی ایک نہایت مشکل اور جان لیوا صنف سخن ہے''۔

ان آرا کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ متوسطین کے عہد میں رباعی نویسی کو مشکل فن قرار دینے پر پورا زور صرف کیا گیا جب کہ موجودہ دور میں بعض جواں سال شعرا مثلاً التفات امجدی، اسلم پرویز اسلم اور رمیش تنہا وغیرہ نے رباعی گوئی سے اپنا شعری سفر شروع کیا ہے اور اس صنف کی عشوہ تابیوں کو رنگ افشاں فکری وفنی ملبوسات سے آراستہ کیا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ شاعرانہ مزاج، موزونیت طبع اور اسلوب و بیان کی خوبیاں قدرت کی جانب سے ودیعت ہوتی ہیں۔ تجربات و مشاہدات قوی اور مطالعہ وسیع ہو تو شاعر اپنی کسی بھی پسندیدہ صنف شاعری میں نادرہ کار اور تخلیقیت افروز خوبیاں سمیٹ سکتا ہے اور اپنی منفرد شناخت بھی قائم کرسکتا ہے۔ شاعر کو اگر زبان و بیان پر خلاقانہ قدرت ہوگی اور اسے شاعری و شعریت کے رموز و علائم سے کماحقہٗ واقفیت ہوگی تو وہ ہر صنف کے مخصوص تقاضوں پر دسترس حاصل کرنے کے ساتھ اچھی اور معیاری رباعیات تخلیق کرنے پر بھی یقیناً قادر ہوگا۔

اب آیئے یہ دیکھیں کہ تاثر انگیز، فنی اعتبار سے مربوط اور لائق تحسین رباعی چار مصرعوں میں کس طرح ترتیب پاتی ہے۔ اس نکتے پر معروف رباعی نگاروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ میں یہاں ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کا تمثیلی انداز میں پیش کردہ بیان نقل کرنے پر اکتفا کروں گا۔ انہوں نے تحریر کیا ہے:

> ''رباعی وہ چار مصرعی صنف سخن ہے جس کے پہلے دو مصرعوں کو میں کمان کے دو بازوؤں سے تعبیر کرتا ہوں، تیسرے مصرعے کو دونوں کوشوں سے بندھے اس تانت سے، جس پر تیر رکھ کر کمان دار اپنی قوت صرف کرتا ہے اور رباعی کے چوتھے مصرعے کو اس تیر سے، جو سیدھا ہدف پر ترازو ہو جائے''۔

یہ تمثیل یقیناً مستحسن اور دلچسپ ہے لیکن میرا خیال ہے کہ نئی نظم نگاری کی تحریکات کے زیر اثر ترقی پسندی اور جدیدیت کے عہد میں مختصر یا منی نظمیں لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا تو Imagist شاعری کا بھی آغاز ہوا۔ اس طرح کی نظم میں کسی ایک نقش کو وسعت دی جاتی ہے، تقویت پہونچائی جاتی ہے اور معنی کے ارتقا و انتہا سے ہم کنار کیا جاتا ہے۔ رباعی کے چار مصرعے بھی اسی طرح ترتیب دیے جانے لگے۔ فضا ابن فیضی کی ایک رباعی میں اس نوع کے نقش اور ارتقا و انتہا کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

؎ دل خون ہو تب شعر کنول بنتا ہے　　افکار کا اک تاج محل بنتا ہے
آساں نہیں تربیت وجدان و شعور　　مشکل سے کوئی جذبہ غزل بنتا ہے

پہلے مصرعے میں ایک نقش ہے، دوسرے میں اسے وسعت دی گئی، تیسرے میں تقویت پہونچائی گئی اور چوتھے مصرعے میں بات ارتقا کی حد تک پہونچ گئی۔ یوں رباعی نے تشکیلیت کی معراج حاصل کرلی۔ میں نے رباعی کے فن کی تشریح وتعبیر اپنی ایک رباعی میں اس طرح کی ہے:

؎ وجدان کا ثمرہ ہے رباعی کا فن　　جذبے کا احاطہ ہے رباعی کا فن
لفظوں کا قبیلہ بھی اگر ساتھ چلے　　معنی کا ذخیرہ ہے رباعی کا فن

رباعی بلاشبہ وجدان کا ثمرہ، جذبے کا احاطہ لفظوں کا قبیلہ اور معنی کا ذخیرہ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ رباعی کے چار مصرعوں میں کوئی داستان، کوئی قصیدہ یا افسانہ گاگر میں ساگر کی طرح سمیٹا جاسکتا ہے۔ قدیم زمانے میں رباعیات کے لیے موضوعات کی فراوانی نہیں تھی لہذا اس کا دائرہ مخصوص موضوعات تک محدود تھا۔ وقت کے تیز بہاؤ کے ساتھ اس کے موضوعات میں تنوع پیدا ہوتا گیا۔ عصر حاضر میں زندگی اور کائنات کے تقریباً تمام پہلوؤں پر رباعی نے اپنی گرفت مضبوط کرلی ہے۔ آج کا ہر رباعی پسند شاعر انسان اور معاشرہ کے منظر ناموں کو اپنی رباعیات میں عکس تاب کرنے کے ہنر سے واقف ہے۔

شاعری میں فلسفۂ حیات و کائنات از اول تا حال موجود رہا ہے لیکن فلسفہ شاعری اور شعری حسیت سے مبرا رہا ہے۔ افلاطون فلسفی بھی تھا اور مفکر بھی لیکن اسے شاعروں اور شاعری دونوں سے شدید نفرت تھی۔ ایک طرف وہ اپنی بے مثال ریاست سے شعرا کو سرحد بدر کردینے پر آمادہ تھا تو دوسری طرف صنف شاعری کو مخرب اخلاق قرار دیتا تھا جب کہ شاعری ہی وہ اہم اور امتیازی فن ہے جس پر دنیا میں سب سے زیادہ تشریحات وتنقیدات لکھی گئی ہیں۔

ارسطو نے شاعری کو تخلیقی عمل قرار دیا جس کی حمایت فلابیر اور کائیتر وغیرہ نے کی۔ فرانس میں بودلیئر، روس میں پشکن، انگلستان میں آسکر وائیلڈ اور امریکہ میں ایڈگر ایلن پو ادب کو اخلاق اور فلسفے کی بندشوں سے آزاد کرانے کے لیے کوشاں رہے۔ ڈاکٹر کوزین کا کہنا تھا کہ ادب مذہب و اخلاق کی خدمت کے

لیے نہیں ہے۔مذہب مذہب کی خاطر اور اخلاق اخلاق کی خاطر ہونا چاہیے۔اقبال نے اس نظریے کو سختی سے رد کیا۔اس لیے کہ وہ فلسفی بھی تھے اور شاعر بھی ،لہذا مقصدیت ،افادیت کے ساتھ ہی انہوں نے اخلاق کو بھی پیش نظر رکھا اور انسانی وتہذیبی اقدار کو بھی۔ہربرٹ نے شاعری کو الہامی کیفیت کہا ہے۔اگر یہ سچ ہے تو اقبال الہامی شاعر بھی تھے اور پیامی شاعر بھی تھے۔اہم بات یہ ہے کہ عوام وخواص ان کے گرویدہ تھے۔قوم کے لیے سرسید کے دل میں بھی ایسی تڑپ تھی جیسی اقبال کے دل میں۔اقبال نے اپنی نظموں میں مرد کامل ،مرد مومن اور مرد قلندر کی اصطلاحات استعمال کی ہیں جو ان کے وجدان کی دین ہیں اور تہذیبی، دینی اور خصوصیت سے اخلاقی اقدار سے متصف ہیں۔کلیات اقبال میں رباعیات کے زیر عنوان ان کے قطعات شامل اشاعت ہیں لیکن ''بانگ درا'' (کلیات ص ۲۸۳) میں ان کی یہ رباعی بھی موجود ہے جو ان کے اخلاقی وقومی اقدار کی غماز ہے:

؎ مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں　　مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلے　　واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

اخلاق اور فلسفہ اخلاق کے زیر عنوان ۱۷ عدد رباعیات ڈاکٹر سید وحید اشرف نے اپنے رباعی کے مجموعے ''آیات'' میں شامل کی ہیں۔اس انداز میں کسی شاعر نے اپنے مجموعے میں رباعیات ترتیب نہیں دی ہیں۔ان کی یہ فکر انگیز رباعی نمونتاً پیش خدمت ہے:

؎ خودغرضی جہاں ہے وہاں عیاری ہے　　خودغرضی کا ہم راز ریا کاری ہے
ضدین ہیں اخلاص و ریا آپس میں　　نوری ہے اگر ایک تو اک ناری ہے

امجد حیدر آبادی رباعی کو شعرا میں امتیازی شناخت رکھتے ہیں۔ان کا شمار ہندوستان کے بلند مرتبت شاعروں میں ہوتا ہے۔اخلاقی قدر کے موضوع پر ان کی ایک خوبصورت رباعی ملاحظہ ہو:

؎ کیا فکر کوئی قدر دان ہو کہ نہ ہو　　جھوٹی دنیا میں عزو شان ہو کہ نہ ہو
اللہ مسرت حقیقی دے دے　　ہم زندہ رہیں نام ونشان ہو کہ نہ ہو

اس رباعی میں مسرت حقیقی کی آرزو مستحسن بھی ہے اور سرور انگیز بھی۔ڈاکٹر طلحہ رضوی برق رباعی

کے مزاج داں بھی ہیں اور اس کے ناقد و مبصر بھی۔انہوں نے مختلف النوع موضوعات پر رباعیات تخلیق کی ہیں۔ان کی یہ خیال انگیز رباعی پیش خدمت ہے:

؎ آپس کا نفاق ہے کلیجے کا گھاؤ　　خطرات زمانہ سے تحفظ نہ بچاؤ
اے حکم و لاتفرقو سے غافل　　ہے وقت کہ تم اب بھی متحد ہو جاؤ

اس رباعی میں قوم کی زبوں حالی اور مسلکی انتشار کو نشان زد کرتے ہوئے متحد ہونے کا پیغام یقیناً قابل عمل ہے۔عصر حاضر کے معروف شاعر، محقق اور نقاد علیم صبا نویدی نے مختلف موضوعات پر بے شمار کتابیں تصنیف کی ہیں۔انہوں نے رباعی کے موضوع پر بھی ایک کتاب ''جہان اردو رباعی'' قلم بند کی ہے۔ان کی یہ رباعی فلسفۂ اخلاق کے نقطہ نظر سے توجہ کی مستحق ہے:

؎ جب ابر گہر بار نظر آتا ہے　　خورشید بھی خوف کھا کے تھراتا ہے
ہم شعلہ کشوں سے تنگ آ کر اکثر　　معلوم نہیں وقت کدھر جاتا ہے

اس رباعی میں روانی اور اثر انگیزی کے ساتھ معنوی تہ داری بھی ہے جو ذہن و دل پر دیر پا نقوش مرتسم کرتی ہے۔ہم عصر رباعی گویوں میں ساغر جیدی نے بھی اپنی پہچان قائم کی ہے۔ان کی ایک رباعی سماعت فرمائیں:

؎ کم لوگ ہیں کاغذ پہ قلم رکھتے ہیں　　کم لوگ ہیں کیسے میں رقم رکھتے ہیں
کم لوگ ہیں چہروں کی نمائش کے لیے　　ٹوٹے ہوئے شیشے پہ قدم رکھتے ہیں

ساغر جیدی کی رباعی میں حقیقت پسندی اور برجستہ گوئی کے ساتھ پیکر تراشی کی خوبی بھی موجود ہے۔آخر میں خاکسار اپنی دو عدد رباعیاں پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہے:

؎ مردم کش و آزار دہندہ انسان　　فطرت ہی سے لگتا ہے درندہ انسان
بے بس نظر آتی ہے مشیت بھی جب　　انسان کو کھا جاتا ہے زندہ انسان

؎ اقدار کے زینے سے اتر جاتی ہے　　ذرات کی مانند بکھر جاتی ہے

کھو دیتا ہے انسان اگر ہوش و حواس　　تہذیب جسے کہتے ہیں مر جاتی ہے

ہمارے اکابرین میں حضرت انیسؔ، آسیؔ غازی پوری، باقرؔ آگاہ، اسماعیلؔ میرٹھی، محرومؔ، رواںؔ، وحشتؔ کلکتوی وغیرہ نے اور معاصر شعرا میں ناوکؔ حمزہ پوری، شاہؔ حسین نہری، خلیلؔ مامونؔ، راہیؔ فدائی، ابراہیم اشکؔ، طہور منصوری نگاہ، فریدؔ پربتی، علقمہ شبلیؔ، قیصرؔ شمیم اور التفاتؔ امجدی جیسے ان گنت شعرا نے اپنی رباعیات کے ذریعہ اخلاقی اقدار کے ساتھ انسانی، تہذیبی، ادبی اور مذہبی قدروں کو بھی تابناکی بخشی ہے۔ اس مستحسن اقدام سے ہمارے دور میں رباعیات کی فنی اور اخلاقی قدر و منزلت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔

اردو کا صوفیانہ ادب

ڈاکٹر خالد سجاد

اردو کے صوفیانہ ادب کا جہاں تک تعلق ہے تو یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا بڑا ہاتھ رہا ہے اور اردو کے ابتدائی نقوش میں صوفیائے کرام کے مرہونِ منت رہے ہیں اور تصوف اور صوفی دراصل لفظ ''صفا'' سے اور بعضوں کے نزدیک یہ لفظ صوف سے مشتق ہے۔اس کی ضد کدورت ہے۔جس شخص نے اپنے اخلاق اور معاملات کو مہذب بنایا اور اپنی طبیعت کو کدورتوں، کھوٹ اور میل سے پاک صاف کرلیا یعنی حق تعالیٰ کی سچی عبودیت کا وصف اپنے اندر پیدا کرلیا تو وہ صوفی بن گیا اور راہِل تصوف میں شامل ہوگیا۔ویسے تصوف اپنے مخصوص تصور سے آگے نکل کر علم دین کے حصول اور تبلیغ واشاعت دین کی مشغولیت بھی اسی کا حصہ ہے۔اس لئے یہاں علماء کا عمومی تذکرہ بھی کیا جائے گا۔

شیخ سید ابوالحسن علی ہجویریؒ جو داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں ان کی فارسی زبان میں ''کشف المحجوب''علم تصوف پر پہلی کتاب مانی جاتی ہے جس کا ذکر حضرت نظام الدین اولیا نے کچھ اس طرح کیا ہے:

''جس شخص کا کوئی مرشد نہ ہو اسے کشف المحجوب کے مطالعہ سے مل جائے گا''۔

حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے اپنے مکتوب میں جگہ جگہ کشف المحجوب کا ذکر کیا ہے۔

''کشف المحجوب'' کا جدید اردو ترجمہ میاں طفیل محمد صاحب نے ۱۹۶۲ء میں کیا ہے جو تصوف کے فن میں سند کا درجہ رکھتی ہے۔''کشف المحجوب''میں تصوف کی حقیقت کو کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''تصوف نیک خوئی کا نام ہے جتنا کوئی شخص نیک خوئی میں بڑھا ہوا ہوگا اتنا ہی تصوف میں بڑھ کر ہوگا''

تصوف کے بعض نکات ایسے ہوتے ہیں جو صاف صاف بیان نہیں کئے جاسکتے۔ان کو اشاروں کنایوں میں بیان کیا جاتا ہے۔تمثیل اس کے لئے بہت کارآمد ہے اسی لئے بندہ نواز گیسو دراز نے اردو کا رسالہ ''شکارنامہ''تمثیلی پیکر میں پیش کیا ہے اس موضوع پر دوسرا رسالہ ''تمثیل نامہ'' بھی ہے۔بندہ نواز گیسو

دراز کی تصنیف ''معراج العاشقین'' بہت مشہور ہے جس کی زبان قدیم ہے:

''انسان کو پوجنے کوں پانچ تن ۔ ہر ایک تن کوں پانچ دروازے ہیں، ہور پانچ دربان ہیں ۔ پیلا تن واجب الوجود مقام اس کا شیطانی نفس اس کا امارہ''۔(اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ)

گیارہویں صدی ہجری میں اردو کی پہلی مکمل تمثیل وجہی کی ''سب رس'' ہے جو نیشا پوری کے فتاحی کی نثری تلخیص حسن و دل اور سنسکرت کے ڈرامہ نگار کرشن مشر کے ڈرامہ ''پربودھ چندرودے'' سے ماخوذ ہے۔ اس میں تصوف کے مراحل اور عشق کے واردات کو تمثیل کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ وجہی نے جس اسلوب کو پروان چڑھایا ہے وہ بہت بعد تک قائم رہا جو داستان، قصے اور نظموں میں تمثیل کا استعمال ہوتا رہا۔

اس طرح ملا وجہی نے ''سب رس'' کے ذریعہ تصوف کے تصورات کی اور زبان و ادب کی بھی بہت بڑی خدمت کی ہے جو قابلِ ستائش ہے جس کی وجہ سے ہم ملا وجہی کو اردو نثر کا عظیم المرتبت مصنف کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

بہار کے اردو نثری ادب کے آغاز میں اسلامی رنگ دکھائی دیتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ بہار کی ابتدائی اردو نثر اسلامی تار و پود سے ہی بُنی گئی ہے ۔صوفیائے کرام نے اسلام کی ترویج و اشاعت کی خاطر مختلف مذہبی رسالے لکھے۔

علمائے صادق پور نے بھی اردو نثر کی تخلیق میں بہت بڑا حصہ ادا کیا ہے ۔صادق پور ایک تحریک اور تنظیم کا مرکز تھا اس لئے علمائے صادق پور نے اردو کو ہی اپنے پیغام رسانی کا ذریعہ بنایا۔علمائے صادق پور نے اپنے مذہبی رسالے اردو ہی میں لکھے۔سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی تفاسیر قرآن کو اردو میں منتقل کیا گیا۔ اس طرح اردو ادب کو صادق پور کی تحریک سے بیش بہا فائدہ پہنچا۔

۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج بند ہو گیا تھا۔۱۸۴۵ء کے قریب ''گل وصنوبر چہ کرد'' کا فارسی سے اردو میں ترجمہ ہوا اور رجب علی بیگ سرور نے ''فسانۂ عجائب'' لکھا۔سید صاحب کی تصنیف ''تنبیہ الغافلین'' کا اردو ترجمہ ہوگلی پریس سے شائع ہوا۔شاہ اسماعیل شہیدؒ کی ''تقویۃ الایمان'' کا اردو زبان میں ترجمہ ہوا جو آج

بھی مشہور و معروف ہے۔اس کے علاوہ متعدد اردو رسائل لکھے گئے جن میں ''ردِ شرک''، ''رسالہ عمل بالحدیث''، ''رسالہ دعوت''، ''تبیان الشرک'' یہ سارے کے سارے رسالے مولانا ولایت علی کی تحریر کردہ ہیں۔

اسی عہد میں تصوف پر بہت سی کتابوں کے ترجمے ہوئے جن میں میر شیر علی افسوس نے ''گلستانِ سعدی'' کا ترجمہ کیا۔''پندنامہ'' سعدی کا ترجمہ مرزا لطف علی معروف بہ مظہر علی خاں ولا نے کیا۔

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد ہندوستانی تہذیب کی چولیں ہل گئیں۔اس موقع پر سرسید اور ان کے رفقاء نے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ جو بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی اسے اختلاف کے باوجود مسلمانوں میں مقبولیت ملی۔اسی طرح حالی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' لکھ کر شعراء کو ایک نئی دنیا سے آشنا کرایا۔شبلی کی تصانیف میں ''اسلامی تاریخ اور سیرت نبویؐ''، ''الغزالی''، ''علم کلام اور سوانح روم'' اور ''خلفائے اسلام پر ''الفاروق'' اور ''المامون'' جیسی عہد ساز تحقیق پیش کی ہیں۔شبلی کے شاگرد عزیز سید سلیمان ندوی اور ان کے معاصرین میں حبیب الرحمٰن شیروانی، عبدالماجد دریابادی اور ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کی تصنیفات سے ہمارے موضوع کا گہرا تعلق ہے۔

مولانا مودودیؒ نے چھوٹی بڑی سو سے زائد تحقیقی کتابیں لکھی ہیں۔ان میں ان کی شہرہ آفاق تفسیر ''تفہیم القرآن'' چھ جلدوں پر مشتمل ہے جس کو عرب و عجم کے مفسرین قرآن مجید اور علمائے کرام نے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔مولانا کی تحریریں ادب انشاء کی بھی معراج تسلیم کی جاتی ہیں اور وہ اسلام پر اتھارٹی مانی جاتی ہیں۔مولانا کی ایسی ہی ایک بلند پایہ کتاب ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' ہے۔مولانا لکھتے ہیں:

> ''دین سے مراد قانون، ضابطہ، شریعت، طریقہ اور وہ نظامِ فکر و عمل ہے جس کی پابندی میں انسان زندگی بسر کرتا ہے۔اگر وہ اقتدار جس کی سند پر کسی ضابطہ و نظام کی پابندی کی جاتی ہے خدا کا اقتدار ہے تو آدمی دینِ خدا میں ہے''

شعر انسانی جذبات و احساسات کے اظہار کا ایک عمدہ وسیلہ ہے۔نثر میں ایسے افکار کو ڈھالنا مشکل ہے۔اقبال کو اصل مقبولیت اور شہرت شاعر کی حیثیت سے ملی نہ کہ نثر نگار کی حیثیت سے۔صوفیا لطیف جذبات اور خیالات کے مالک ہوتے ہیں وہ قلبی واردات کے لئے شاعری کو ہی وسیلہ اظہار بناتے ہیں۔رومی کی

شاعری اس کا ثبوت ہے۔

امیر خسرو: ہندوستان میں صوفیائے کرام کی جو تحریک چلی خسرو اس کی ایک اہم کڑی مانے جاتے ہیں۔ تصوف انہیں صرف عزیز ہی نہیں تھا بلکہ وہ اپنے وقت کے پیرومرشد خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے ہر دل عزیز شاگرد تھے۔ خسرو اپنی فارسی شاعری کے علاوہ ہندی شاعری، پہیلیوں، دوہوں، گیتوں کے لئے مشہور ہوئے۔ خسرو کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف دروز وصلش چوعمر کوتاہ
سکھی پیا کوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

پہیلی ایک مثال ؎

بالا تھا جب سب کو بھایا　　بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو، کہہ دیا اس کا ناؤں　　بوجھے نہیں تو چھوڑو گاؤں

اردو زبان پر صوفیانہ اثرات کو بیان کرتے ہوئے عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے کہ:

''اردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی جو نہایت قدیم زمانہ سے تصوف کا مرکز ہے۔ اس لئے ابتداء ہی سے اس میں صوفیانہ خیالات کی آمیزش ہوگئی۔ قطب شاہ کے بعد عالم گیر کے زمانے میں اردو شاعری نے زیادہ ترقی کی تو مستقل طور پر صوفیانہ لٹریچر کی بنیاد قائم ہوگئی ہے''۔

ہندو پاک کے جن صوفیا نے اردو زبان کے شعری ادب کے لئے خدمت انجام دی ہیں اور اس زبان کی نشو ونما میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں۔

شیخ عبدالاحد وحدتؔ: آپ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

ذرا تو سوچ اے غافل کہ کیا دم ٹھکانا ہے
نکل ہی جب گیا تن سوں تو پھر اپنا بگانا ہے
مسافر توں ہے اور دنیا سرائے بھول مت غافل
سفر ملک عدم آخر تجھے درپیش آنا ہے
لگا دیا دیں اس کی نجات اپنی اگر چاہے
عبث دنیا کے دھندھے میں ہوا گل کیوں دوانا ہے

مرزا مظہر جانِ جاناں : فارسی کی طرح اردو میں بھی آپ کی قیادت و سیادت مسلّم ہے۔ان کے صوفیانہ کلام کے چند نمونے اس طرح ہیں۔

آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سین　　مینا لگا ہے جب سیتی مجھ بے نوا کے ہاتھ

☆

لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہر　　فی الحقیقت میں گھر گیا مظہر

☆

الٰہی مت کسو کے پیش رنج و انتظار آوے　　ہمارا دیکھئے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

انعام اللہ خاں یقین: آپ شیخ عبدالاحد وحدت گل کے پوتے ہیں۔ بقول جمیل جالبی:

''یقین نے اعلیٰ خاندان میں جنم لیا۔امارت میں آنکھ کھولی۔مرزا مظہر کی تربیت نے ان کے جوہر کو نکھارا۔مجدد الف ثانی کے روحانی فیض نے انہیں ابھارا اور شروع ہی سے ایسی شاعری کی جو اس دور کے باطنی تقاضوں کی خوشبو سے لبریز تھی''۔(تاریخ ادب اردو۔مجلس ترقی ادب لاہور،جلد۔۲،ص:۱۲۳)

ہم ان کے کلام میں عام بول چال کی زبان زیادہ پاتے ہیں۔

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے　　اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے

☆

قیامت آپ پہ اس اس قدر سے لا چکے ہم تو　　کہاں تلک کوئی محشر کا انتظار کرے

☆

یقین کے واقعے کی سن خبر وہ بدگمان بولا　　یہ دیوانہ تو کچھ ایسا نہ تھا بیمار کیا کہے
مرنے کی طرح میں نے جو یہ اختیار کی　　دیکھا تو زندگی میں مزا کچھ رہا نہ تھا

☆

دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوا کی ہے ہوس　　کوچۂ یار میں کیا سایۂ دیوار نہ تھا

میر محمد باقر حزیں : حزیں دہلی کے رہنے والے تھے۔مرزا مظہر جانِ جاناں کے مرید۔محمد شاہ کے زمانے میں نادر شاہ کے حملے کے بعد عظیم آباد آ گئے ۔

پاؤں تلک بھی ہائے مجھے دسترس نہیں　　بے طرح دیوانگی پر عشق میں آیا ہے دل

☆

دیکھئے اب زندگی کا کیا مرے اسلوب ہو　　عاشقوں کے دل میں کب ہے صبر کی طاقت حزیںؔ

☆

نوحہ کرنے میں نہیں ان بے قراروں کا گناہ　　میں چاہتا ہوں عشق کو چھپاؤں پہ کیا کروں

محمد فقیر دردمند :محمد فقیر دردمند بھی مظہر جانِ جاناں کے مرید تھے۔دردمند کے ''ساقی نامہ'' پر جمیل جالبی لکھتے ہیں ''دردمند کا ساقی نامہ اس دور میں مربوط شاعری کا ایک قابلِ ذکر نمونہ ہے'' ۔

اس آتش سے میرا نہ کر دل کباب　　نہ کر میری طاقت کے زہرہ کو آب

☆

ارے مجھ سے کیا جرم واقع ہوا　　کہ دل تیرا مجھ سے جو یوں پھر گیا

مرزا عبد القادر بیدل : آپ عظیم آباد میں پیدا ہوئے ۔ایک مدت تک شہزادہ محمد اعظم کے دربار سے منسلک رہے۔آپ ایک صوفی مشرب شاعر تھے۔میر حسن کے ''تذکرہ شعرائے اردو'' میں بیدل کے دو اشعار اردو اس طرح ہیں (بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء۔اختر اورینوی) ۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدلؔ کہاں ہے ہم میں

خواجہ میر دردؔ : دراصل دردؔ ہی ایک ایسے شاعر تھے کہ جن کے یہاں تصوف اپنی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ شاعری اور تصوف دونوں کا تعلق جذبات اور تخیل کی پیدا کردہ دنیا سے ہے اس لئے صوفیوں نے شاعری کو اس کا بہترین وسیلہ اظہار بنایا۔ اردو شاعری ابتداء سے اب تک کسی دور میں بھی تصوف سے خالی نہیں رہی۔ عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے کہ ''خواجہ میر دردؔ نے سب سے پہلے اردو زبان کو صوفیانہ خیالات سے آشنا کیا ''(شعرالہند۔ص:۲۲۰)

دردؔ کے چند اشعار پیش کرنا ہی کافی ہے ۔

بستے ہیں تیرے سائے میں سب شیخ و برہمن　　آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا

☆

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا　　تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

☆

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں　　دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں
مٹ جائیں ایک دم میں یہ کثرت نمائیاں　　گر آئینے کے سامنے ہم آکے ہو کریں
تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جایو ابھی دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

سید عماد الدین عمادؔ: سید عماد الدین عمادؔ ایک بلند پایہ صوفی شاعر گزرے ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو ۔

بیچ نظر کے ایدھر او دھر ہر دم آوے جاوے ہے
مل بے ظالم تس پر ٹک دیکھے کو تر ساوے ہے
جب ستی چھوڑس کھانا پینا تیرا دوانہ اُلفت میں

خون جگر کا پیوے ہے اور غم غصہ کو کھاوے ہے

☆

رباعی: یارب نگہ عنایت ادھر کردو کانٹا ہے عماد تم گلِ تر کردو
ہے رنگ گنہ سیتی رخ اس کا کالا تم غازۂ عفو سین منور کردو

آیت اللہ جوھری: جوہری صوفیانہ مذاق رکھتے تھے۔ان کے کلام میں تصوف کی ہماہمی اور عشقِ حقیقی کی گرمی پائی جاتی ہے۔اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تا قیامت بند ہونے کا نہیں ہے بابِ فیض عقدۂ دل ناخنِ دستِ پیمبر سے کھلا

☆

عشق پر زور نے کیا کیا نہ کیا خانہ خراب کوہکن کو ہے ہوا قیس ہوا صحرائی

☆

جی میں آتا ہے کہ دل سب سے جدا کر لیجئے شوخ اس بت کے تئیں اپنا خدا کر لیجئے

شاہ نورالحق طپاں پھلواروی: آپ کو بچپن سے شاعری کا ذوق تھا۔آپ کی فارسی غزلوں کے علاوہ اردو مراثی کی ایک ضخیم بیاض آج بھی موجود ہے۔طپاں کی مشہور غزل کے اشعار کچھ اس طرح ہیں جو زبان زد خاص و عام ہیں ؎

تمنا ہے کہ ہر دم تیری صورت دیکھتے رہتے
تو ہوتا سامنے ہم تا قیامت دیکھتے رہتے
کیا سجدے میں لاکر کس نے مجھ کو کشتۂ حیرت
جو ہوتے بت کدے میں حق کی قدرت دیکھتے رہتے
غلام ان کا ہوں پھر کیوں کر نہ مجھ کو بخش دیتے وہ
وہ کن آنکھوں سے بیٹھے میری ذلت دیکھتے رہتے

سید شاہ رکن الدین عشقؔ: عشق اردو کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ان کی صوفیانہ شاعری کا ایک الگ

رنگ ہے جوانہیں دوسروں سے بلند مقام عطا کرتا ہے۔عشق کے نزدیک عشقِ حقیقی کائنات کی سب سے بڑی طاقت ہے اوراس کا دائرہ بہت وسیع اور لامتناہی ہے۔ان کے اشعار میں تصوف کا رنگ کچھ اس طرح ہے ؎

دیدۂ دل جو کرتے وا دیکھا　　حرم و دیر میں خدا دیکھا
اس کے دامن تلک نہ پہنچے ہم　　خاک میں آپ کو ملا دیکھا
آشنا تجھ سے ہو نہ ہو کوئی　　پر تجھے سب سے آشنا دیکھا

غلام علی راسخ: راسخ کے کلام میں بھی سوز و گداز کے ساتھ تصوف کا رنگ بہت ہی نمایاں نظر آتا ہے ؎

نہیں ہوش والوں پہ کچھ حسد، مجھے رشک ہے تو انہوں پہ ہے
جنہیں تیرے جلوہ کے سامنے مری طرح بے خبری رہی

☆

صبح سے بیتابی ہے دل کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہے　　دیکھئے کیا ہو شام تلک جی آج بہت گھبراتا ہے

حضرت عبد العلیم آسی: آسی دنیائے تصوف کے تابندہ ستارہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے کلام میں تصوف کی جلوہ آرائیاں اور عشقِ حقیقی کی سرمستیاں ہم نمایاں طور پر دیکھ سکتے ہیں ؎

تابِ دیدار جو لائے مجھے وہ دل دینا　　منہ قیامت میں دکھا سکنے کے قابل دینا
تیرے دیوانے کو بے حال ہی رہنا اچھا　　حال دینا ہو اگر رحم کے قابل دینا

☆

رو کر آسی پوچھتا تھا کب قیامت آئے گی　　کس طرح کہئے کہ وہ تیرا تمنائی نہ تھا

☆

وعدہ بھی ہے تو ہے قیامت کا　　جس کو ہم آزما نہیں سکتے

سید شاہ فرزند علی صوفی منیری: فرزند علی صوفی منیری نے تصوف کی متعدد نثری اور شعری تصانیف لکھی ہیں جس سے آپ کے گہرے علمی مذاق اور ادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

نثری کتابوں میں ''راحت روح'' ایک تمثیلی داستان ہے جس میں صوفیانہ خیالات پیش کئے گئے

ہیں ۔ ''راحت روح'' کو ڈاکٹر محمد طیب ابدالی نے دوسری مرتبہ ایڈٹ کر کے طبع کرایا ہے ۔ راحت روح کے علاوہ ان کی کئی نثری تصنیف اردو زبان میں ملتی ہے ۔

صوفی منیری نے اپنا کلام غالب کی خدمت میں ڈاک کے ذریعہ دہلی روانہ کیا ۔ غالب نے ان کے کلام پر دو دو صاد بنا کر ان کے کلام کو واپس کیا ۔ اس سے صوفی منیری کے کلام کی عظمت واضح ہوتی ہے ۔ غالب نے صوفی منیری کو پیر و مرشد سے خطاب کر کے خط لکھا ۔

نورِ حق جلوہ رب شانِ الٰہ　　ہے تو بندہ مگر اللہ اللہ

حسرتِ دید بس نکل جائے　　دل سے دل کی ہوس نکل جائے

جی دیا ہم نے مدعا نہ ملا　　خوں بہا اور خوں بہا نہ ملا

دل کو چاکِ جگر سے راہ ہوئی　　بے قراری قرار گاہ ہوئی

ولی دکنی : ولی نے جس زمانے میں اردو شاعری شروع کی اور ان کی شاعری پروان چڑھی وہ ماحول خالص صوفیانہ تھا اور ولی کا خاندان بھی خدا ترسی اور تصوف کے اعتبار سے مشہور تھا ۔ ولی کی اردو شاعری کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری عشقِ مجازی کے بعد ہی عشقِ حقیقی کے درجہ میں آتی ہے ۔

پاک بازوں سے یہ ہوا معلوم　　عشق مضمون پاکبازی ہے

ڈاکٹر شارب ردولوی اپنی تصنیف ''مطالعہ ولی'' کے صفحہ ۴۵ پر رقم طراز ہیں :

> ''بحیثیت ایک صوفی شاعر کے ولی ایک خاص اہمیت کے مالک ہیں ۔ اس زمانے کے مزاج میں تصوف رچا بسا ہوا تھا ۔ اخلاق اور فکر پر وہی چھایا ہوا تھا ۔ تصوف ہی علمیت اور بلند مذاقی کا معیار تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ ولی نے بڑی خوبی اور کامیابی کے ساتھ تصوف کے مسائل کو اشعار کا جامع پہنایا ہے ۔ ان کے صوفیانہ خیالات صرف غزل کے اشعار تک ہی محدود نہیں بلکہ مثنویوں میں بھی اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے'' ۔

ولی کی صوفیانہ غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسنِ بے حجاب اس کا　　بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا
ہوا ہے مجھ کو شمع بزم یک رنگی سوں یو روشن　　کہ ہر ذرے پر تاباں ہے دائم آفتاب اس کا
مرا دل پاک ہے از بس ولی زنگِ کدورت سوں　　ہوا جیوں جوہر آئینہ مخفی پیچ و تاب اس کا

(کلیاتِ ولی مارہروی۔ص:۱۲)

سراج اورنگ آبادی: سراج صوفی اور اہلِ درد شاعر تھے۔سراج کو دکن میں ولی کا جانشیں تسلیم کیا جاتا ہے۔سراج کے کلام میں تصوف کے نکات بھی ہیں اور غزل کا کیف وکم بھی۔ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہماری آنکھوں کی پتلیوں میں ترا مبارک مقام ہے گا
پلک کے پٹ ہم نے کھول دیکھے تو عین ماہِ تمام ہے گا
سراج اس شعلہ رو میں ہرگز گل روا ہے نہ عاشقوں کو
تمام جلتی ہے شمع ہر شب عبث پتنگوں کا نام ہے گا

سراج کی مشہور غزل صوفیانہ خیالات سے کس قدر لبریز ہے۔اشعار ملاحظہ کریں ؎

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا، نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی
شہ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی
چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی
کیا خاک آتشِ عشق نے دلِ بے نوائے سراج کو
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

میر تقی میر: میر تقی میر غزل گوئی کے اعتبار سے ناخدائے سخن کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔وہ بھی

شاعر تصوف تھے۔ان کی غزلکوں میں صوفیانہ خیالات کا در آنا ان کے ماحول، تربیت اور خاندانی ورثہ کی وجہ سے تھا۔میرؔ کے اشعار میں تصوف کے رموز و اسرار ہیں۔آپ بھی ان اشعار کو دیکھتے چلیں ؎

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں — معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا
تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا — خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا
کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا — یکسر وہ استخواں شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھی کسو کا سرِ پُرغرور تھا
تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ — سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

خواجہ حیدر علی آتشؔ: آتشؔ کے زمانے میں دہلی پر غم واندوہ کے بادل چھائے ہوئے تھے اس لئے ہر شخص حزن ویاس کا پیکر تھا۔اس لئے صوفیانہ رجحان عام ہوگیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ آتشؔ نے تصوف کے مسائل کو بہت ہی خوش اسلوبی سے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔آتشؔ عملی طور پر صوفی تو نہ تھے لیکن صوفیانہ خیالات کو علمی وفنی طور پر اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔آتشؔ کی یہ غزل اس حقیقت کی ترجمان ہے۔اشعار ملاحظہ ہو ؎

تازہ ہو دماغ اپنا تمنا ہے تو یہ ہے — اس زلف کی بو سونگھئے سودا ہے تو یہ ہے
محشر کو بھی دیدار کا پردہ نہ کرے یار — عاشق کو جو اندیشۂ فردا ہے تو یہ ہے
گہ یادِ صنم دل میں ہے گہ یادِ الٰہی — کعبہ ہے تو یہ ہے جو کلیسا ہے تو یہ ہے
دل کے لئے ہے عشق تو دل عشق کی خاطر — مے ہے تو یہ ہے اور جو مینا ہے تو یہ ہے
بینا ہوں جو آنکھیں تو رخِ یار کو دیکھیں — نظارے کے قابل جو تماشا ہے تو یہ ہے
ثابت دہنِ یار دلیلوں سے کر آتشؔ — حجت کی جو شاعر کے لئے جا ہے تو یہ ہے

اسداللہ خاں غالبؔ: غالبؔ صوفی شاعر نہیں ہیں لیکن غالبؔ نے جس فنکارانہ انداز میں صوفیانہ خیالات کو اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے وہ صوفی شعراء کے کلام میں بھی کم ہی نظر آتا ہے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غالبؔ کی ایک صوفیانہ غزل کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں جس میں صوفیانہ حقائق کا رنگ و آہنگ صاف نظر آتا ہے ۔

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں　　یہ سوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے　　نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے　　جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی　　ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود　　ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

مومن خاں مومنؔ: مومنؔ سلسلۂ ولی اللہی سے وابستہ تھے۔مومنؔ کا ایک شعر جس پر غالبؔ اپنا پورا دیوان دے دینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔باریٔ تعالیٰ سے راز و نیاز کا ایک زندہ نمونہ ہے ۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

علامہ اقبالؔ: شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ کا مطالعہ بہت وسیع تھا خصوصاً سفر یورپ نے ان کے تجربات میں وسعت پیدا کی۔انہوں نے فلسفہ،اسلامی تاریخ،حدیث اور تفسیر کے ساتھ ساتھ تصوف کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ کا نظریۂ تصوف محض اصطلاحی نہیں تھا بلکہ وہ عملی طور پر اس کے قائل تھے ۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی　　ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

اقبالؔ کو کائنات کے ہر ذرہ میں اسی کی جلوہ گری نظر آتی ہے ۔

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے　　انساں میں وہ سخن ہے غنچہ میں وہ چٹک ہے

اقبالؔ کے صوفیانہ کلام کا ایک منفرد لہجہ ملاحظہ ہو ۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں　　کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ　　کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

اقبالؔ نے تصوف کو نئے انداز میں روشناس کیا ہے ۔

میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں　　غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند　　میری فغاں سے دستخیز کعبہ و سومنات میں

فانی بدایونی : فانی فطری شاعر تھے۔اردو کے اکثر شعراء نے ایک دو شعر تصوف کے ضرور کہے ہیں۔فانی صوفی شاعر نہیں تھے لیکن وہ شاعرِ تصوف ضرور تھے۔''فانی کی شاعری'' میں پروفیسر ضیاء احمد بدایونی فرماتے ہیں کہ:

> ''تصوف کا عنصر ان کے یہاں واقعی اور اصلی ہے۔یہ صحیح ہے کہ عملی تصوف سے ان کی زندگی نا آشنا رہی تاہم نظری تصوف ان کے یہاں محض رسماً یا برائے گفتن ہے''۔

فانی کی شاعری میں عشقِ حقیقی کی ایک دھیمی دھیمی آنچ ہے۔فانی صاف اور واضح انداز میں کہنے سے گریز نہیں کرتے ہیں ۔

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا　　ایک گوشہ ہے یہ دنیا اسی ویرانے کا
تیرا نگاہِ شوق کوئی راز داں نہ تھا　　آنکھوں کو ورنہ جلوۂ جاناں کہاں نہ تھا
مفہوم کائنات تمہارے سوا نہیں　　تم چھپ گئے نظر سے تو سارا جہاں نہ تھا
فانی فسونِ موت کی تاثیر دیکھنا　　ٹھہرا وہ دل کہ جس پہ سکوں کا گماں نہ تھا

اصغر گونڈوی : اصغر گونڈوی کا نمایاں پہلو تصوف ہے مگر ان کا انداز بیان شاعرانہ ہے۔اسی لئے اصغر کو صوفی شاعر کہنے میں نقادوں کی رائے مختلف ہے۔عبدالسلام سندیلوی ''تصوف اور اصغر گونڈوی'' میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''غرض کہ حافظ کی شاعری میں جس قسم کے صوفیانہ رموز و نکات موجود ہیں وہ اصغر کے کلام میں بھی ملتے ہیں۔اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اصغر کی شاعری تصوف کی شاعری ہے۔ایسی صورت میں مجنوں کا یہ قول کہ اصغر کی شاعری میں حافظ کی مستی۔خیام کی تیکھی حکمت یا رومی کی عرفانیت نہیں ہے سراسر غلط ہے.....اصغر کی ندرت پسند طبیعت نے تصوف کے لئے اپنی نئی راہ تلاش کی ہے مگر بہر حال یہ نئی راہ تصوف ہی کی طرف جاتی ہے''۔

ذیل کے اشعار میں اصغر کے صوفیانہ خیالات کی جلوہ گری ہمیں نظر آتی ہے ۔

ترکِ مدعا کردے عین مدعا ہو جا　　شانِ عبد پیدا کر مظہر خدا ہو جا
اس کی راہ میں مٹ کر بے نیازِ خلقت بن　　حسن پر فدا ہو کر حسن کی ادا ہو جا
آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو　　پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا
قطرۂ تنک مایہ بحرِ بیکراں ہے تو　　اپنی ابتدا ہو کر اپنی انتہا ہو جا

✿✿✿✿✿

جھارکھنڈ کی اردو غزل، سب سے بڑی اخلاقی قدر لفظ 'خدا' کے حوالے سے

ڈاکٹر سرور ساجد
استاذ شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جہاں تک اخلاقی اقدار کا سوال ہے تو وہ لوگ یا وہ مکتبۂ فکر جو اخلاقی اقدار کے باغی ہیں اور سرے سے اخلاقی اقدار کے وجود کو مانتے ہی نہیں، ان کے یہاں بھی اخلاقی اقدار خوب خوب موجود ہیں۔ یہ دنیا جب سے وجود میں آئی ہے تب سے انسان اپنے سماج، مذہب، تمدن اور معاشرت کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوششوں میں ہر لمحہ مصروف ہے۔ کلچر اور مذہب دو ایسے بنیادی عناصر ہیں جن کے زیر اثر اخلاقی قدروں کا تعین ہوتا رہا ہے۔ اخلاقی اقدار کے پس منظر اور عہد بہ عہد اس کے ارتقا کا مطالعہ اگر اسے ایک موضوع مان کر کیا جائے تو یہ مطالعہ اخلاقی قدروں کا موضوعی مطالعہ قرار پائے گا لیکن جیسے ہی ہم ادب کے حوالے سے اخلاقی قدروں کے مطالعے کی بات کرتے ہیں تو اس میں کئی زاویے بڑھ جاتے ہیں اور معاملہ علم سے آگے بڑھ کر ادب یعنی تخلیق کے تقاضوں سے بھی وابستہ ہوجاتا ہے۔ پھر ادب کی مختلف اصناف کے حوالے سے اخلاقی قدروں کی کارکردگی کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو شاعری کے سلسلے میں یہ بات بارہا کہی جا چکی ہے اور اب تقریباً اسے قبول کرلیا گیا ہے کہ شاعری ادب کی تمام اصناف میں سب سے لطیف اور ایجازی و اشاری صنف ہے۔ پھر شاعری کی مختلف اصناف کے تناظر میں یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ غزل کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ غزل کے ایک شعر میں جس روانی، چابک دستی اور تخلیقی تکمیلیت کے ساتھ ایک مکمل بات پر اثر انداز میں لفظوں کی کفایت شعاری کے ساتھ کہہ دی جاتی ہے اس کی مثال دوسری جگہ ملنی مشکل ہے۔ یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس کی وجہ سے غزل اردو ادب کی سب سے مقبول ترین صنف تصور کی جاتی ہے۔

برصغیر کی موجودہ غزلیہ فضا کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات صاف طور پر نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ جھارکھنڈ کا غزلیہ منظر نامہ برصغیر کے غزلیہ منظر نامے سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے بھی اپنی کچھ انفرادی پہچان بھی رکھتی ہے جس میں جھارکھنڈ کے پیسٹورل عناصر کا دخل ہے اور کچھ جغرافیائی حالات کی وجہ سے بھی اس کی انفرادیت زیادہ نمایاں ہو کر منعکس ہوئی ہے۔ جھارکھنڈ کی موجودہ اردو غزلوں کا جائزہ اگر اخلاقی اقدار کی پیشکش کے حوالے سے لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ جس طرح برصغیر کی اردو غزل میں اخلاقی اقدار کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے موازنہ کی ایک فضا یوں تیار کی جا سکتی ہے کہ خدا جو خود ایک قدر ہے اور اس قدر سے وابستہ سینکڑوں ایسی اخلاقی قدریں ہیں جو زندگی کے لائحہ عمل، روحانی مسائل، اخلاقی مسائل، فلسفیانہ مسائل، معاشرتی مسائل سے عبارت ہیں اور ہمارے ایمان کا حصہ ہیں لہٰذا خدا کی ذات سے بڑی کوئی بھی اخلاقی قدر ہمارے پاس موجود نہیں۔ اب اگر اس قدر کے حوالے سے برصغیر کی اردو غزلوں کا جائزہ لیا جائے اور پھر جھارکھنڈ کی اردو غزل کا مطالعہ کیا جائے تو صورت حال کچھ اس قسم کی نظر آتی ہے۔ نمائندہ جدید غزل گو شاعر محمد علوی نے اپنی کتاب کے انتساب میں لکھا ہے کہ ''اس خدا کے نام جس کے نہیں ہونے کا مجھے دکھ ہے'' اس جملے کی تلخی کو اگر وارث علوی کے اس بیان سے جوڑ کر دیکھا جائے کہ ''اگر خدا ہے تو اسے معاشرے میں نظر بھی آنا چاہیے'' تو سکے کے دونوں رخ ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور معاشرے کی ظاہرداری اور چھوٹے چھوٹے فائدے کے لیے اخلاقی قدروں کی پامالی کا جو سلسلہ ہے دراصل مذکورہ دونوں جملوں میں اسی کا نوحہ بیان ہوا ہے۔ اب خدا کے حوالے سے برصغیر کے نمائندہ شعرا کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

؎ دل مطمئن ہے اس کی رضا کے بغیر بھی　　ہر کام چل رہا ہے خدا کے بغیر بھی
(سلطان اختر)

؎ وہ خدا ہے تو مری روح میں اقرار کرے　　کیوں پریشان کرے دور کا رہنے والا
(ساقی فاروقی)

؎ خدا ہمارا آسمان پر مرا نہیں ہے زندہ ہے　　پاشی صاحب ہرج ہی کیا ہے یہ افواہ اڑائے میں

(کمار پاشی)

مذکورہ تینوں اشعار چند نمونوں کے طور پر پیش کیے گئے ہیں ورنہ یہ مختصر فہرست خود ایک کتاب بن سکتی ہے۔ان اشعار میں بظاہر جو کیفیت نظر آتی ہے وہ ہمیں بھڑکاتی ہے اور پہلی اور سطحی نظر میں ہمارے عقیدے پر چوٹ لگتی ہے لیکن اگر ان اشعار کا تجزیہ کیا جائے تو پہلے شعر میں یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ آخر ہر کام خدا کے بغیر کیوں چل رہا ہے۔ہمارے معاشرے نے خدا کو طاق پر کیوں رکھ دیا ہے۔ہمارا سماج لین دین کا سماج کیوں بن کر رہ گیا ہے۔دوسرا شعر اس بات کا علامیہ ہے کہ خدا اگر روح میں موجود ہو تو خود وہ انسان کے وجود کا حصہ بن جائے گا اور انسان سے خود بخود کوئی غلط فعل سرزد ہوگا ہی نہیں چونکہ ہمارے سماج نے خدا کو اپنے وجود حصہ نہیں بنایا اسی لیے خدا دور کا رہنے والا یا اجنبی معلوم ہوتا ہے جس سے انسان کو نہ ڈر لگتا ہے نہ ہی وہ اس کی مروت میں ہی برے کاموں سے رکتا ہے۔تیسرا شعر کچھ زیادہ ہی تلخ ہے لیکن جیسا کہ اوپر میں نے عرض کیا کہ بظاہر جو لوگ اخلاقی قدروں کے مخالف نظر آتے ہیں ان کے یہاں اخلاقی قدروں کا انعکاس زیادہ تہہ داری کے ساتھ ہوتا ہے۔مذکورہ اشعار میں بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے۔مذکورہ تینوں شعرا برصغیر کے نمائندہ غزل گو شعرا میں گنے جاتے ہیں۔ان شعرا کے مقابلے میں جب ہم جھارکھنڈ کے غزل گو شعرا کی طرف رخ کرتے ہیں تو متعدد شعرا مذکورہ شعرا کے مقابلے میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔یہاں تفصیل کا موقع نہیں لہذا صدیق مجیبی کے یہ دو اشعار پیش خدمت ہیں:

؎ اچھا ہے نہ یاد آئے کہ میرا بھی خدا تھا　　ہونٹوں پہ بہت تلخ بیاں ساتھ ہے میرے

؎ روشن ضمیر بننے کا اک خبط تھا کبھی　　خوش ہوں کہ تجربوں نے یہ حسرت نکال دی

ان اشعار کی روشنی میں جو پہلی بات نظر آتی ہے وہ یہ کہ یہ اشعار اپنے موضوع، پیشکش، اسلوب، زبان، تیور کو یا ہر اعتبار سے اس لائق ہیں کہ انہیں سلطان اختر، ساقی فاروقی اور کمار پاشی کے اشعار کے شانہ بہ شانہ فخریہ طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔اب ذرا دونوں اشعار پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ پہلے شعر کی تہہ میں بھی خدا جیسی عظیم قدر کے حوالے سے شاعر نے دراصل سماجی نظام کی بدعنوانی کو ہی پیش کیا ہے چونکہ شعر میں زبان

کی ماہیئت عام زبان کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے اس لیے شعر کے ایک ایک لفظ کا ایک نیا معنوی پس منظر مرتب ہونے لگتا ہے اور باتوں کے اتنے سرے ابھرنے لگتے ہیں کہ انہیں سمیٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ دوسرے شعر پر اگر پچھلی گفتگو کی روشنی میں غور کیا جائے تو اس شعر میں کلیدی ٹکڑے کے طور پر جو دو ٹکڑے یعنی ''روشن ضمیر'' اور ''خبط'' ہیں وہ طنز کے عمدہ نمونے ہیں اور ان دونوں ٹکڑوں کی نشتریت سے شاعر نے جو تلخ منظر نامہ مرتب کیا ہے وہ بے حد پر اثر ہے اور غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اخیر میں اظفر جمیل کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

؎ تمام کر دے خدا ہم پہ ہی ستم سارے　　ہمارے بعد کی نسلوں کو مسکرانے دے

یہ شعر بھی ایک انوکھا اور نرالا شعر ہے۔ اس شعر کے خیال پر غور کیجیے شاعر خدا سے مخاطب ہے اور کہہ رہا ہے کہ اے خدا تجھے جتنے ستم کرنے ہوں ہم پر کر کے ختم کر دے لیکن ہماری آنے والی نسلوں کو مسکرانے دے دراصل یہ خیال نئی نسل کی اسٹرگل کا اظہار ہے لیکن شاعر نے جن رموز و علائم اور الفاظ کو جس پس منظر میں پیش کیا ہے وہ چونکہ تخلیقی اظہار ہے اس لیے اس کے لفظ لفظ میں پیچ ہے۔

بحیثیت مجموعی جھارکھنڈ کی غزلیہ شاعری کا منظر نامہ بہر اعتبار اس لائق ہے کہ ہر پہلو سے اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

اخلاقی قدروں کے فروغ میں اردو ادب کا حصہ

(نذیر احمد کے ناولوں کے حوالے سے)

ڈاکٹر جمال احمد

استاذ شعبۂ اردو، ونووا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ

تاریخ کتنی ہی کروٹیں کیوں نہ بدلے، زمانہ عروج و زوال کی کتنی ہی کہانیاں کیوں نہ سنائے، نشیب و فراز کی داستانیں کتنی ہی کیوں نہ لکھی جائیں۔ تغیر و تبدل کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ کتنا ہی کیوں نہ جاری رہے۔ ہر شے بدلتی ہے اور بدلتی رہے گی۔ لیکن سچائی کے اصول اور صداقت کا راستہ جو ہمیشہ سے تھا وہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ اس سچ کے سورج کو کبھی گہن نہیں لگ سکتا۔ اور سب سے بڑا سچ یہ ہے کہ انسان ایک دوسرے کا احترام کرے۔ یہی اصول عدم تشدد کو بھی جنم دیتا ہے۔ اسی سے رواداری کی کونپلیں پھوٹتی ہیں اور اسی باہمی احترام سے امن کا دروازہ بھی کھلتا ہے۔ یہی وہ سچائی ہے جس کا راز اگر کوئی پاگیا تو اس نے سربلندی حاصل کی اور دنیا کے لیے ایسا کچھ کر کے گیا، کہ بہت یاد رہا۔

ہمارے اردو کے ادبا اور شعرا اپنی تخلیقات کے ذریعے تابناک اور بہتر زندگی کے لیے جس طرح سے جدوجہد کرتے رہے، لڑتے رہے کیا آج ہم اس کو تحفظ دے پار ہے ہیں؟ ان شعرا و ادبا کا ایک اصول تھا باہمی احترام اور رواداری، عدم تشدد۔ اسی پھول سے سب کے لیے پیار و محبت کی خوشبو نکلی، اسی پھول سے سماجی زندگی میں بدعنوانیوں کی گندگی دور کی جا سکی۔

مغربی علوم و نظریات کی آمد کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں مغربی اصناف نظم و نثر کو بھی فروغ ہوا۔ عقلی و فکری سطح پر وسعت پیدا ہوئی تو اظہار کے قدیم طریقوں میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ نئے پیمانوں کو قبول کرنے کی روایت نے جنم لیا۔ انگریزوں کی آمد سے قبل باشندگان برصغیر کے اخذ و استفادے اور جذب و قبول کے رشتے عرب و فارس سے قائم تھے۔ ہندوستان کا علمی ذخیرہ جو اس سے قبل مذہب، تصوف، تاریخ اور فنون لطیفہ پر مشتمل تھا۔ فلسفہ، نفسیات، طبعیات، ریاضیات، لسانیات اور جدید سائنسی و میکانکی علوم سے بھر گیا۔ زرعی

معاشی نظام کی جگہ صنعتی انقلاب نے لے لی تو ایک پورا کلچر بدل کے رہ گیا۔بیسویں صدی اسی پھیلاؤ کا نقطہ عروج ہے۔اصناف نظم ونثر کی اس ترقی کی وجہ سے رنگا رنگ اور متنوع موضوعات ادب میں داخل ہو گئے۔ مذہب و اخلاق اور انسانی و روحانی قدروں کا درس روز اول ہی سے اردو ادب کا حصہ رہا ہے۔معاشرت و ثقافت، ارضی وسماوی رشتے اور خدا، انسان اور کائنات کے باہمی ربط ضبط پر غور وفکر کی روایت بھی زمانہ قدیم سے ہی موجود ہے۔چنانچہ انیسویں اور بیسویں صدی کا سارا ادب انہی روایات کی توسیعی شکل ہے۔بیسویں صدی کے ادیبوں نے روایت کے اس تسلسل کو قائم رکھا اور اس میں نئے معانی بھی پیدا کئے۔انہوں نے قومی دکھ درد کو اپنا ذاتی دکھ درد بنا کر پیش کیا ہے۔رنگ ونسل اور مذہب وفرقہ کے امتیازات سے بالاتر ہو کر، انہوں نے تمام ہندوستانیوں کے دل کی دھڑکنوں کو اپنی تخلیقات میں سمویا ہے۔انصاف و آزادی اور قومی افتخار وعزت کو انہوں نے عزیز تر تصور کیا اور ہم وطنوں میں قومی غیرت وحمیت کو بیدار کر کے انہیں قومی سربلندی اور کامیابی کے حصول کی جدوجہد کی ترغیب دی۔

ہمارے اردو ادب میں جن اخلاقی اقدار عالیہ کے زندہ اجزا کو سمویا گیا ہے اور جذب کیا گیا ہے۔وہ مندرجہ ذیل ہیں۔اور ان کے کئی اقسام ہیں۔

پہلا انفرادی اقدار جیسے طہارت، سادگی، سنجیدگی، سچائی، صبر، استقلال، ہمت، حوصلہ، محنت، انکساری، خلوص، وقت کی پابندی، ضبط نفس، اطاعت، قناعت وغیرہ۔

دوسرا سماجی اقدار جیسے محبت، مروت، حق وصداقت، ہمدردی، اصول پرستی، فرض شناسی، اتحاد، اتفاق، محنت، مشقت، اجتہاد، انہماک، ایثار وقربانی، خدمت خلق، سخاوت، شجاعت وغیرہ۔

تیسرا تہذیبی اقدار جیسے ذوق لطیف، ضمیر پاک وخیال بلند، جہاں ادب سے، ہنر سے، مذہب سے، اخلاق سے، فنون لطیفہ سے، انسانیت سے اور جمال کے پہلو سے والہانہ عشق پیدا ہو جاتا ہے۔

چوتھا روحانی اقدار جس سے سیرت بنتی ہے، مالک کے جلال، جمال کا احساس، ایمان، اسلام، احسان کا شعور، خوف خدا، یاد الٰہی وتلاش حق کی آرزو، خدا بینی، خود بینی وجہاں بینی کا مشق، علم الیقین، عین الیقین وحق الیقین کا حصول، نفس امارہ، نفس لوامہ، نفس مطمئنہ کی آزمائش، صبر وشکر وفقر کی رفاقت اور رضائے

ربانی، رحمت کبریائی و نیابت الٰہی کا عشق، ان سب کے وجود سے اخلاقی کردار و شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔

ہمارے اردو ادب کا خزانہ جواہرات اور اخلاق حسنہ سے بھرا پڑا ہے۔ آسمان ادب پر سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر عبدالحق، مولانا ابوالکلام آزاد کی تخلیقات آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ ان کی تخلیقات میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی بھرمار ہے۔ اپنی تخلیقات میں اخلاقی، سماجی، معاشی، ادبی، علمی و مذہبی معاملات پر انہوں نے ایسی گہری روشنی ڈالی کہ ایک عظیم انقلاب برپا ہو گیا۔ ان کی تحریروں و تقریروں سے جہاں بلند خیالی، روشن خیالی، حب الوطنی، انسان دوستی، رواداری اور خوشحالی کے بیش بہا سوتے پھوٹے وہیں تقلیدات، توہمات، رسومات، خرافات، تعصب و تنگ نظری دور ہوئی۔

سرسید ہوں یا شبلی، حالی ہوں یا نذیر احمد یہ سب بزرگ اس بات پر متفق تھے کہ:

۱۔ مذہب اسلام فطرت سے مطابقت رکھتا ہے۔

۲۔ ہر زمانے کی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

۳۔ اسلام اور سائنسی علوم میں کوئی منافرت نہیں۔

۴۔ قومی اور ملی ترقی کے لیے اعتقاد کی پختگی اور مذہبی ورثے کا تحفظ ضروری ہے۔

اب اگر اس تناظر میں کسی صاحب کے یہاں کہیں فرق آتا ہے تو وہ صرف طریقہ کار کا ہے۔ سرسید نے سماجی اور معاشرتی میدانوں میں بہتری کے لیے ادب کا سہارا لیا۔ تحریر و تقریر کی طاقت سے کس کو انکار ہے۔ یہی وہ قوت تھی جس نے سرسید کے قدم مضبوط کیے۔ سرسید نے تعلیم کو کامیابی کی کلید جانا اور اس کی ترویج کے لیے کوشاں ہوئے۔ انہوں نے مردوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے پر زور دیا۔ جب کہ عورتوں کی تعلیم کے لیے ان کے یہاں کوئی خاص لائحہ عمل نظر نہیں آتا۔ ان کا خیال تھا کہ مردوں کے تعلیم پانے کے بعد اس کا فیض خود بخود عورتوں تک پہنچ جائے گا۔

الطاف حسین حالی اہل وطن سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ خواب غفلت چھوڑو۔ اخوت، محبت، عدل و انصاف کے ساتھ رہو۔ حالی کے نزدیک اطلاق آدمیت کے لیے سب سے اہم چیز "اتفاق و اتحاد" ہے۔ لوگوں کے اندر جب حسن اتفاق ختم ہو جاتا ہے تو وہ تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ حالی حب الوطنی میں ایثار و قربانی،

ہمدردی اور مساوات کا سبق دیتے ہیں۔ مذہب، رنگ و نسل، ذات برادری کی مذموم رسوم کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

نذیر احمد نے اردو ادب میں ناول کے فن کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے سادہ اخلاقی اور تعمیری کہانیاں تحریر کیں۔ وہ ہندوستان کے متوسط مسلم طبقے کے طرز حیات، ان کے مسائل، بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داریوں کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔ نذیر احمد نے ناول، ادب اور فن کی آبیاری کی غرض سے نہیں لکھے۔ انہوں نے کچھ خاص مقاصد کے حصول کے لیے قصہ کہانی کو دلچسپ اور موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے ناولوں کا اولین مقصد تلقین و اصلاح ہے۔ اپنے ناولوں میں انہوں نے تعلیم و تربیت خانگی امور میں عورت کی سلیقہ مندی، اطاعت شعاری اور مذہبی وابستگی کا درس دیا ہے۔ ان کی نظر میں کامیاب اور خوشحال زندگی بسر کرنے کے لیے مذہب ایک لازمی جز کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جو عورت دین کی طرف سے بے توجہی برتتی ہے۔ اس کی گھریلو زندگی انتشار سے پاک نہیں رہتی۔ وہ مسلمانوں کی اخلاقی، سماجی اور مذہبی اصلاح چاہتے تھے۔ انہوں نے ناولوں کے کینوس کو مسلمانوں کی گھریلو اور اجتماعی زندگی تک محدود کر دیا۔ وہ محدود نقطہ نظر کے باوجود ابن الوقت، ظاہر دار، آزادی بیگم اور کلیم جیسے کرداروں کی مدد سے زندگی کا صحیح رخ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ قوم کو جہالت اور توہم پرستی سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد بڑے عالم تھے۔ ناول نگاری کے امام جانے جاتے ہیں۔ مراۃ العروس، بنات النعش، توبتہ النصوح، محصنات، ابن الوقت، رویائے صادقہ اور ایامی ان کے ناول ہیں۔ نذیر احمد کو اس بات کا شعور تھا کہ ایک مذہبی تہذیب (جیسی کے ہند مسلم تہذیب تھی) کے ثقافتی اور تمدنی مظاہر میں مذہب کی حیثیت کتنی اہم ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ایک پرانی ثقافتی شخصیت کے باطن میں نئے دور کی معنویت کو مذہب کے حوالے کے بغیر راسخ نہیں کیا جا سکتا۔ توبتہ النصوح کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

> ''ارادہ یہی تھا کہ بلا تخصیص مذہب، حسن معاشرت، تعلیم اور نیک کرداری اور اخلاق کی ضرورت لوگوں پر ثابت کی جائے لیکن نیکی کو مذہب سے جدا کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص روح کو جسد سے یا خوشبو کو گل سے یا نور کو آفتاب سے یا عرض کو جوہر سے یا ناخن کو

گوشت سے علیحدہ اور منفرد کرنے کا قصد کرے''۔

یہی وہ بنیادی تناظر ہے کہ جس کے اندر رہتے ہوئے وہ اپنے ناولوں میں معاشرتی تضادات کے اسباب وعلل، افراد کے روحانی ضعف اور اعتقادی ضرورت پر زور دے کر ذات کے اردگرد ایک تہذیبی حصار کی تعمیر کرتے ہیں۔ان کے نزدیک اس عہد کے سیاق وسباق میں مذہب کا احیا اخلاقی، تہذیبی اور ثقافتی شخصیت کے تحفظ اور تعمیر دونوں کے لیے ضروری ہے۔ان کے تین اہم ناولوں توبتہ النصوح (۱۸۷۴ء) فسانہ مبتلا (۱۸۸۵ء) اور ابن الوقت (۱۸۸۸ء) میں بالترتیب کلیم مبتلا اور ابن الوقت کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے۔

ادبی تاریخ میں نذیر احمد کو یہ امتیاز حاصل رہے گا کہ وہ افسانوی ادب کی دنیا میں پہلے شخص تھے کہ جنھوں نے اخلاقی قدروں اور تہذیبی ومعاشرتی قدروں کے سیاق وسباق میں عورت کے کردار اور اس کے مسائل پر سب سے پہلے توجہ دی۔نذیر احمد نے اس احساس کو فروغ دینے کی کوشش کی کہ ایک معاشرتی توازن اور تہذیبی لطافت میں عورت ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ان کے پہلے ناول مراۃ العروس کا موضوع خواتین کی تعلیم اور خانگی تربیت ہے۔انہیں شدت سے احساس تھا کہ وہ بنیادی اکائی جو معاشرے کی تعمیر کا پہلا پتھر ہے گھر کہلاتی ہے۔گھر کی کوکھ سے ہی معاشرہ جنم لیتا ہے اور اس کی فضا کا اثر کسی بھی کلچر پر مثبت یا منفی انداز میں ہوسکتا ہے۔گھر کی فضا کی تعمیر میں عورت کو جو اہمیت حاصل ہے اسی کے پیش نظر انہوں نے خانگی امور میں عورت کی سلیقہ مندی، تنظیم، اطاعت شعاری اور دوراندیشی کو بڑی اہمیت دی ہے۔مراۃ العروس اور بنات النعش (۱۸۷۲ء) میں انہوں نے ساری توجہ اس امر پر مرکوز رکھی ہے۔چونکہ اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود وہ بہت سے پرانے معاشرتی رسوم ورواج سے جان نہیں چھڑا سکے تھے۔اسی لیے ان کا یہ خیال ان کے فکری نظام کا حصہ رہا ہے کہ عورت کی حرمت گھر کی چہار دیواری میں ہی قائم رہ سکتی ہے۔اسی لیے ان کے تعلیمی اور تربیتی پروگرام کی ساری تدوین گھر کی چہار دیواری کے اندر ہی ہوتی ہے۔مراۃ العروس میں اعتراف کرتے ہیں:

> ''ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ زیادہ پڑھنا عورتوں کو ضروری نہیں وہ صرف اس حد تک تعلیم حاصل کریں کہ اپنے گھر کی بات دوسروں پر ظاہر نہ کرنا پڑے''۔

گویا نذیر احمد کے نزدیک اتنی تعلیم کافی ہے کہ دوسروں کی مدد کے بغیر گھر کو چلایا جا سکے۔ اور خط و کتابت میں دوسروں کی مدد نہ لینی پڑے۔ نذیر احمد کے تعلیمی اور اصلاحی فریم میں اصغری ایک مثالی تصویر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اصغری کی شخصیت کا سارا متن ہی اس بات میں مضمر ہے کہ وہ کفایت شعاری کے ساتھ گھر چلاتی ہے۔ ایک اعلیٰ پائے کی منتظم ہے۔ معاملات کو سمجھنے اور سلجھانے میں خاص ملکہ رکھتی ہے۔ اسی کے طفیل اس کی نند محمودہ تمام دنیوی ہنروں سے آراستہ ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف بڑی بہن اپنے پھوہڑپن کی وجہ سے نہ صرف اپنی زندگی ناخوشگوار اور اجیرن بنا لیتی ہے۔ بلکہ پورے گھر کو ایک عذاب میں مبتلا کر کے رکھ دیتی ہے۔

حقیقت میں دونوں بہنوں کے کردار وہ مثبت اور منفی قدریں ہیں جن کے فروغ سے بنیادی معاشرتی اور تہذیبی اکائی ''گھر'' کی تعمیر بھی ہو سکتی ہے اور تخریب بھی۔ نذیر احمد نے اپنے نظام فکر کے اس نیوکلس کو صرف ان دو ناولوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ دوسرے ناولوں میں بھی جن کا بنیادی موضوع کچھ اور ہے۔ اس فکر کا اعادہ کرتے رہے ہیں۔ مثلاً فسانہ مبتلا کی غیرت بیگم اپنے خاوند کے دل سے سلیقہ مندی سے عاری ہونے کی وجہ سے اتر جاتی ہے۔ توبتہ النصوح کی نعیمہ اس لیے پژمردہ ہے کہ اس کی ساتھی لڑکیاں سلیقہ مندی اور ہنر کی بدولت اپنے گھروں میں راج کر رہی ہیں لیکن وہ اپنے گھر پر اس طرح پڑی ہے جیسے گلی کا کتا۔

بہر حال نذیر احمد کی دیگر تصانیف میں معاشرتی سطح پر پیش آنے والے ہمہ قسم کے مسائل زیر بحث آجاتے ہیں۔ اسی طرح اس ناول میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ مذہبی مسائل کے ساتھ ساتھ دوسری قسم کے تہذیبی مسائل، علم، سیاست، تربیت نسواں سب زیر بحث آگئے ہیں۔

سیاسی اور معاشی ابتری کے اپنے اس عہد میں انہوں نے ملی، اخلاقی اور مذہبی قدروں کی بقا کے لیے جس لائحہ عمل کی تدوین کی اور جسے انہوں نے اپنے ناولوں میں پیش کیا وہ ان کی اپنی کاوش فکر کا ہی نتیجہ تھی۔

انگریزوں کے ساتھ مصالحت اور یگانگت، جدید تعلیم کا حصول، مذہب کی پیروی اور شریعت پر عمل کرنے والے کا رہن سہن، تمدنی سطح پر ایک ثقافتی اور رواجی تشخص یہ وہ خطوط تھے جن پر وہ اپنے عہد کے ہند مسلم معاشرے کی تعمیر چاہتے تھے۔ اب کہاں کہاں تضاد ہیں اور کہاں کہاں راہ عمل نکلتی ہے اس کی کچھ زیادہ پروا انہوں نے نہیں کی۔ عقلی طور پر توانا اور جذباتی طور پر راسخ العقیدہ افراد کی پرورش ان کی غایت ہے۔

تہذیب وثقافت کے شعبوں (علوم وفنون، رہن سہن، انسانی تعلقات اور اوڑھنا بچھونا) سے جب مذہبی اور روحانی اقدار رخصت ہوجاتی ہیں اور ان کی جگہ افادہ پسندی اور عقل پرستی لے لیتی ہے تو پھر ایک بالکل ہی دوسری ثقافت اور اسلوب زندگی ظہور میں آجاتا ہے۔ انسانی رشتوں کی ایک نئی ترتیب قائم ہوتی ہے۔ اخلاقیات کا ایک نیا تصور سامنے آتا ہے۔ نذیر احمد اپنی تخلیقات میں پرانے اخلاقی نظام اور رشتوں کی ترتیب قائم رکھنا چاہتے ہیں اور ساتھ ساتھ افادہ پرستی اور عقلیت پرستی کو بھی نہیں چھوڑنا چاہتے۔

نذیر احمد نے مندرجہ بالا تمام اقدار کو اپنے ناولوں میں سمونے کی کوشش کی اور اس میں وہ بہت حد تک کامیاب رہے۔ موجودہ دور میں اسکول میں اخلاقی تعلیمی قدروں کی اہمیت کو تسلیم کیا جارہا ہے اور اسے فروغ دینے کی شعوری کوشش بھی ہورہی ہے۔ آج دنیا آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہے، اسلحہ کی دوڑ جاری ہے، دہشت گردی اور تشدد روز کے معمول بن گئے ہیں۔ بدعنوانیوں کے سانپ سماج کے اعلیٰ ترین اخلاقی اصولوں کو ڈستے جارہے ہیں اور دنیا کا عام آدمی کچھ مایوسی، کچھ محرومی کا شکار اور کچھ بددل سا نظر آتا ہے۔ ایسے میں آج اور بھی زیادہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کی ضرورت بڑھ گئی ہے۔ اخلاقی قدروں کا مطلب وہ اصول ہیں جسے فرد اور سماج مل کر منظور کرتے ہیں۔ بہتر اخلاقی قدریں فرد اور سماج دونوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اس طرح اخلاقی قدر کا تعلق ہماری دلچسپیوں اور رغبتوں سے ہے جو شخص عقل مند اور بہتر کردار کا مالک تسلیم کیا جاتا ہے اسے نیک وبد، اچھے، برے، رحم وسنگدلی جیسے اوصاف کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ نذیر احمد نے روشن خیالی اور مقصدیت سے اثر قبول کیا۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق انہوں نے اس روایتی تصور کو رد کیا جو معاشرے میں رائج تھا۔ انہوں نے نہ صرف نظریاتی طور پر بلکہ دل سے عورتوں کی تعلیم کو ضروری خیال کیا۔ اس کی افادیت کو جانتے ہوئے اس کو عملی طور پر لاکو کرنے کی بھی کوشش کی۔ وہ عورتوں کی مذہبی، روحانی، اخلاقی تعلیم کے ساتھ انہیں علوم جدیدہ اور مغربی تہذیب وتمدن اور علم وہنر کی خوبیوں سے بھی بہرہ مند کرنا چاہتے تھے۔

اردو غزل کے فروغ میں سیاسی تحریکات کا حصہ: اخلاقی اقدار کی روشنی میں

(نئی اردو غزل اور سیاسی و سماجی و اخلاقی تناظر)

ڈاکٹر امتیاز احمد

استاذ شعبہ اردو متھلا یونیورسٹی دربھنگہ

اردو غزل خصوصاً نئی غزل میں سیاسی و سماجی انسلاک کا منظر نامہ اخلاقی قدروں کی روشنی میں حقیقت پسندی سے متصف نظر آتا ہے۔سیاست و سماج کا باہمی ربط اس سے ظاہر ہے کہ ہر سماج سیاسی سروکار رکھتا ہے۔یعنی انتظام وانصرام کے بنیادی تقاضوں کو سمجھتا اور اسے حتی المقدور پورا کرنے کی کاوشوں میں مصروف رہتا ہے۔ٹھیک اسی طرح کوئی بھی سیاست سماجی سروکار سے پرے ہو کر اپنی فطری پہچان قائم نہیں رکھ سکتی بلکہ اپنے وجود کی معنویت سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔سیاست و سماج کے متعلقہ رشتوں سے ان کے درمیان اخلاقی نظام کی تشکیل کا مرحلہ بھی سرانجام پاتا ہے۔یہ اخلاقی نظام ان قدروں کی پاسداری کا نام ہے، جن سے خیر وفلاح کے جذبات فروغ پاتے ہیں، اچھائیوں کی ترغیب وتحریک ملتی ہے اور جو نوع انسانی کے لیے مسرت و انبساط کا سرچشمہ ثابت ہوتی ہیں۔شاعری کی خوبیوں میں بھی سیاسی و سماجی سطح پر انسان کے لیے بہتری کی سوچ بنیادی درجہ رکھتی ہے۔جناب کلیم الدین احمد نے اردو شاعری پر ایک نظر (جلد اول) کے پیش لفظ میں آرنلڈ کے خیالات پیش کیے ہیں۔یہاں آرنلڈ کے ان خیالات سے ایک اقتباس پیش کرنا برمحل معلوم ہوتا ہے، ملاحظہ کریں:

> ''اس لیے ضروری ہے کہ جب ہم شعر پڑھیں تو ہمیں اچھائی کا احساس ہو، جو حقیقت میں اعلیٰ اور افضل ہے اور جو زور اور مسرت کا سرچشمہ ہے۔اس کا زندہ احساس ہو اور یہ احساس ہمیشہ باقی رہے اور ہم جو کچھ بھی پڑھیں اس کی صحیح قدر و قیمت کی جانچ پر کھ اس

زندہ احساس کی کسوٹی پر کریں''۔

ہمارے ملک کی مختلف سیاسی وسماجی تحریکات نے مختلف عہد میں اپنے اپنے اثرات قائم کیے اور زمانہ کے کئی مروجہ طور طریقوں سے استفادہ بھی کیا۔ سیاسی منظر نامہ کے تعلق سے پہلی جنگ آزادی سے لے کر ۱۹۱۴ء تک کا زمانہ ہنگامہ آرائیوں سے قدرے الگ تھلگ رہا ہے۔ اسی دور میں کئی تحریکوں اور تنظیموں نے اپنی اپنی موجودگی کو موثر طور پر پیش کرنے کی سعی کی۔ ان کوششوں کے اثرات اردو شاعری پر بھی پڑے۔ اردو شاعری نے اپنے عہد کی عکاسی کی اور اپنے انداز میں کی۔ اسی صدی کی اگلی دوسری دہائی میں ۱۸۔۱۹۱۴ میں پہلی جنگ عظیم ہوئی اور پھر ۱۹۱۷ء میں روس کا انقلاب بھی سامنے آیا۔ ان سیاسی وسماجی تحریکات نے اردو شاعری کو احتجاجی ومزاحمتی بلکہ بغاوتی تیور کے اثرات سے مملو کیا۔ اس دور میں اقبال پر نظر ڈالیں تو وہ سرمایہ دارانہ اور مذہب بیزارانہ نظام کے نقائص اجاگر کرتے نظر آتے ہیں تو جوش ملیح آبادی اپنی بلند آہنگ آواز میں انقلابی پیغامات پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام بھی وہ سیاسی وسماجی تحریکات پیش کرتے ہیں، جن کے تحت اردو ادب کی فکری اور فنی صورت حال متاثر ہوتی نظر آتی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے سیاسی وسماجی اثرات بھی اردو ادب پر گہرے انداز میں مرتسم ہوئے۔ آزادی کے بعد ملک میں مختلف سیاسی وسماجی مسائل پیدا ہوئے۔ فرقہ وارانہ منافرت، لسانی ومذہبی اختلافات اور پھر آگے چل کر بابری مسجد قضیہ کے حوالے سے مختلف تکلیف دہ واقعات کے سیاسی وسماجی اثرات نے بھی اردو ادب کو فکری سطح پر کئی افکار واسالیب عطا کیے۔

ان تمام سیاسی وسماجی تحریکات کے زیر اثر پیدا کردہ ادب کی اخلاقی صورت حال کیا رہی یا اردو شعرا اور ادبا کی تحریروں میں احتجاج واصلاح کی صورت حال اخلاقیات کی کس حد تک پاسداری کرتی ہے، جب ہم ان سوالوں سے روبرو ہوتے ہیں تو ہمیں کسی حد تک اطمینان ہوتا ہے کہ ہمارے شعرا وادبا نے اس باب میں اخلاقی قدروں کو اپنانے کی کوشش کی ہے اور مسلسل کوشش کی ہے۔

چونکہ اردو ادب میں شاعری خصوصاً غزل نگاری کو فوقیت حاصل ہے لہذا یہاں ہم نئی غزل کی روشنی میں یہ دیکھیں گے کہ اخلاقی قدروں کی صورت حال کیا ہے۔ یہاں ہم مکمل اردو غزل کے بجائے نئی اردو غزل

پر اس لیے اپنی توجہ مرکوز کر رہے ہیں کہ اردو غزل کے حوالے سے مختلف جہتوں اور کیفیتوں کے مطالعے سامنے آتے رہے ہیں لہذا انہیں دہرانے سے بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ آج کے شاعر اپنی غزلوں میں سیاسی وسماجی تناظرات میں اخلاقی قدروں کو کس طور پر برتنے کی قدرت رکھتے ہیں اس کا ایک اجمالی خاکہ سامنے آجائے۔

اس تعلق سے یہ دیکھیں کہ اخلاقی اقدار سے ہماری کیا مراد ہے؟ لغت میں اخلاق کا مطلب ملنساری ،کشادہ پیشانی، آؤ بھگت ہے اور قدر سے مراد بزرگی وتوقیر کے ہے۔یعنی اخلاقی اقدار میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن کا تعلق خیر وفلاح سے ہے،عمدہ اور اچھی عادتوں سے ہے۔بری اور نقصان دہ عادتوں سے بچنے اور ان کے خلاف چلنے کا عمل بھی اخلاقی اقدار میں شامل ہے۔انسانوں کی پریشانیوں پر تڑپ اٹھنا،ان کی حتی المقدور مدد کرنا،ظلم وجبر کے خلاف احتجاج ومزاحمت کا رویہ اختیار کرنا، سچ کا فروغ اور جھوٹ وافترا پردازی کے خلاف مورچہ کھڑا کرنا، یہ وہ اوصاف ہیں جن کا تعلق اخلاقی اقدار سے ہیں اور یہ سیاسی وسماجی سطح سے تعلق رکھتے ہیں۔انفرادی وخاندانی حوالوں سے اخلاقی اقدار ہم انہیں کہیں گے، جن کا تعلق والدین اور دیگر بزرگوں و عزیزوں نیز رفیقوں وغیرہ کے عزت واحترام سے ہے۔ہم اخلاقی قدروں کی بدولت اپنی ازدواجی زندگی اور زندگی کے دیگر تمام معاملات میں سچی کامرانی حاصل کر سکتے ہیں۔یعنی اخلاقی قدروں کی بدولت سیاسی وسماجی تصویر امن وامان سے پر دنیا کی تصویر پیش کرتی ہے۔

اب آیئے ہم نئی غزل کے تناظر میں دیکھیں کہ مختلف سماجی و سیاسی تحریکات کے عوامل کس طرح اخلاقی اقدار کی روشنی سے فیضیاب ہوتے ہیں۔کچھ عرصہ قبل کی سیاسی وسماجی صورت حال پر غور کیجئے تو درج ذیل اشعار کی اخلاقی معنویت یعنی اپنے جذبات کا اپنے عصری حالات کی پیشکش کا فنی طریقہ سامنے آئے گا:

اب ہواؤں سے کیا گلہ کیجئے　　خاک ہے در بدر تو ہو گی ہی

(عرفان صدیقی)

گرتی ہوئی دیوار کو سب دیکھ رہے تھے　　اس شہر میں کچھ اور تماشا بھی نہیں تھا

(مظہر امام)

رنگ لپک سے عاری جسم ادا سے خالی　　یہ کیسی بستی ہے عکس ہوا سے خالی

(بانی)

بیج بوتے ہیں جو ہواؤں میں　　کتنے معصوم ہیں وہ بے چارے

(پرکاش فکری)

درختوں کا لہو شامل ہے شاید　　ہوا کا ذائقہ بدلا ہوا ہے

(سلطان اختر)

اخلاقی قدروں کے حامل شعرا کا ایک وصف یہ بھی رہا ہے اور ہے کہ وہ مذہبی واقعات وحالات کے تناظر پر نہ صرف نظر رکھتے ہیں بلکہ ان سے استفادہ بھی کرتے ہیں۔ تلمیحی اشعار کے ذریعہ وہ کہیں زندگی کی صداقتوں کو پیش کرتے ہیں تو کہیں حق بیانی اور بیباک روی کو راہ دیتے ہیں۔ کہیں وہ پند ونصیحت کے زمرے میں اسے فنکارانہ پیکر میں پیش کرتے ہیں تو کہیں احتجاج ومزاحمت کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ کہیں وہ اصلاح معاشرہ کی صورتوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو کہیں انفرادی تہذیب وتربیت کی خاکہ سازی کرتے ہیں۔ کئی اردو غزل میں یہ صورت حال یعنی ایسی سماجی وسیاسی تنظیم کی اخلاقی بازگشت کثرت سے مقام درمقام ملتی ہے اور یہ ایک خوش آئند اور صحت مند علامت ہے جسے فراخ دلی کے ساتھ اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ لہذا یہاں نئی غزل سے اس قسم کے اشعار پیش کرنے میں بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ آپ ان اشعار کے ذریعہ جہاں تلمیحی دنیا کی سیر کرسکتے ہیں وہیں مختلف سیاسی وسماجی تناظر میں اخلاقی ذمہ داری کے تئیں شعرا کی سنجیدگی کا بھی مشاہدہ کرسکتے ہیں:

یہ دنیا بھی تو جنت کی کوئی تصویر ہوجاتی　　اگر حرص و ہوس میں مبتلا آدم نہیں ہوتا

(فرید پربتی)

ایک دن تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی　　پھر کسی نمرود کو مچھر اڑالے جائے گا

(عطاعابدی)

خود ہی پانی میں تمہیں راہ بنانی ہوگی　　اب کوئی موسیٰ عمراں نہیں آنے والا

(قیصر صدیقی)

تری فرعونیت کی ہے تو بس اوقات اتنی ہی　　بہا کر بے گناہوں کا لہو اترانا آتا ہے
(وسیم بریلوی)

حیات جاوداں چاہو تو خضر راہ بن جاؤ　　خدا اس کو مٹا دیتا ہے جو شداد بنتا ہے
(ظفر صدیقی)

جگا پائیں نہ صدیاں بھی کہ ہم تو　　بہت آگے ہیں اصحاب کہف سے
(عطا عابدی)

عمر و عیار کی زنبیل میں رکھا کیا ہے　　حق کی تلوار ہیں، حمزہ کی صدا ہیں ہم بھی
(شمس فریدی)

ساحل سے ہمیں لوٹ کے جانا بھی نہیں ہے　　کشتی کو مگر آج جلانا بھی نہیں ہے
(منور رانا)

اپنے کعبے کی حفاظت تمہیں خود کرنی ہے　　اب ابابیلوں کا لشکر نہیں آنے والا
(معراج فیض آبادی)

ہے مجھے پھر وہی نادیدہ حقیقت کی تلاش　　کون سی روح تھی ناچیز ابابیلوں میں
(منظر اعجاز)

یہ کون آیا کہ قدموں کی دھول سے اس کے　　فراز کوہ پہ غار حرا چمکنے لگا
(صدیق مجیبی)

دعائیں مجھ سے لے جاتے ہیں پتھر مارنے والے　　مرا منصب ہی ایسا ہے دلوں میں گھر بناتا ہوں
(عطا عابدی)

اس کا امکان نہیں سوز بلالی کے بغیر　　کعبہ عشق میں ہو صوت اذاں کی تعمیر
(منظر اعجاز)

ندی سے پیاس ملی ہے اسی گھرانے کو　　کہ جس کے واسطے پانی چٹان سے نکلا

(اسلم بدر)

یہ بھی غلط نہیں کہ وہ پیاسا ہی مرگیا　　یہ بھی ہے سچ کہ سارا سمندر اسی کا تھا

(اسلم بدر)

سرجائے وفاداریٔ بیعت نہ چلی جائے　　صحرائے جنوں تیری روایت نہ چلی جائے

(صدیق مجیبی)

مذہبی و تلمیحی پیرائے کے علاوہ بھی شعرا نے نئی غزل کے ذریعہ حالات حاضرہ کی قبیح روایتوں اور غیر منصفانہ نظام و دیگر عصری امور پر اپنے احتجاجی رویے کا شعری مظاہرہ کیا ہے۔ اس قبیل کے چند اشعار دیکھیں:

نیزے پہ رکھ کے اور مرا سر بلند کر　　دنیا کو اک چراغ تو جلتا دکھائی دے

(ظفر کورکھپوری)

ہر دور میں تم ٹھہروگے معیار ہوس کا　　دھرتی سے محبت کا ہم اندازہ رہیں گے

(عبدالاحد ساز)

دوستو روشنی کے لیے کچھ کرو　　وہ چراغ محبت بجھانے کو ہے

(سراج اجمل)

صحافت کی تقدس پر میرا ایمان تھا لیکن　　خبر سے میڈیا والے یہاں بیوپار کرتے ہیں

(انور ایرج)

چاہتا یہ ہوں کہ دنیا ظلم کو پہچان جائے　　خواہ اس کرب و بلا کے معرکے میں جان جائے

(مظفر حنفی)

رفتہ رفتہ چھٹ گئی گمراہیوں کی ساری دھند　　اس طرح کچھ آفتاب حق نما روشن ہوا

(ناز قادری)

خیر سے صبر و توکل ہے قرینہ مرا　　کون کہتا ہے کہ دشوار ہے جینا مرا

(رئیس الدین رئیس)

یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ جس کی وسعت کو کئی کتابوں میں سمیٹا جانا چاہیے۔

قابل مبارکباد ہیں عزت مآب ڈاکٹر احمد سجاد صاحب اور منتظمین سمینار کے جنہوں نے ایسے موضوع کو زیر بحث لایا ہے۔اس پر باضابطہ تحقیقی کام کیے جانے کی راہ کھل جائے گی۔میں نے اس وسیع موضوع کو اپنے لیے سہل بنانے کی خاطر اردو شاعری میں سیاسی خدمات کو اختیار کرلیا۔اس میں بھی میرا تعلق غزلوں سے قائم رہا۔اس لیے کہ اردو کے غزل کو شاعروں نے بھی اس موضوع کو اختیار کیا ہے۔اور انتہائی شریفانہ انداز میں اسے اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ذیل میں ہم کچھ اس کا خاکہ آپ کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔

غرض نئی نسل کے شعرا کے یہاں خیر و شر کی تمیز کا نہ صرف اشارہ ملتا ہے بلکہ خیر کے استقبال اور شر کے نفی کی بازگشت بھی ملتی ہے۔سماجی و سیاسی آئینہ داری اخلاقی اور شعری تقاضوں کے دائرے میں بخوبی ہو رہی ہے۔وقت کے ساتھ سیاسی و سماجی نظام میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں،نئی غزل کے شعرا نے ان تبدیلیوں کو نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ اس کے لیے مثبت عوام سے اپنی رضامندی بھی ظاہر کی ہے۔ضرورت ہے کہ ہمارے اردو معاشرے کے مقتدر حضرات ایسے مخلص اور صالح شعرا و ادبا کی حوصلہ افزائی بے لوث اور ایمان دارانہ طور پر کریں۔حوصلہ افزائی اور قدر افزائی کے باب میں تعصب و عصبیت کی جو قدریں غیر محسوس یا غیر شعوری طور پر ہی سہی، اگر کسی نہج سے ہم سے نمو پا رہی ہیں تو یہ اخلاقی جرم کے مترادف ہے جو ہم سے سرزد ہو رہا ہے۔ادبی معاشرے کے لیے لازم ہے کہ اخلاقی رواداری کے دلائل اور دعوے صرف زبانی یا تحریری طور پر نہ کریں بلکہ اپنی زندگی اور اپنے عمل سے اس کا ثبوت فراہم کریں۔تبھی ہم ایک فلاحی سیاسی و سماجی معاشرے کا تصور کر سکتے ہیں۔آخر میں میں اپنی بات عطا عابدی کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

ادب ہی زندگی میں جب نہ آیا　　ادب میں اتنی محنت کس لیے ہے؟

اردو میں نعت گوئی۔اسباب مقبولیت

ڈاکٹر محمد جمال مصطفےٰ

ایم،اے(ڈبل)ال،ال،بی۔پی،ایچ،ڈی

اردو میں نعت گوئی کا فن عربی و فارسی کے زیر اثر آگے بڑھا ہے۔تاریخی اعتبار سے اردو میں نعت گوئی کی روایت نئی نہیں، پرانی ہے، اتنی ہی پرانی جتنی کہ خود اردو شاعری۔قدیم دکنی شعرا سے لے کر آج تک اردو کا شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے نعتیہ اشعار نہ کہے ہوں۔یہ الگ بات ہے کہ کسی خاص شغف اور لگاؤ کے ساتھ کہے ہیں، کسی نے محض تکلفات سے کام لیا ہے۔کسی نے تواتر و اہتمام سے اس کام کو انجام دیا ہے اور کسی نے گاہے گاہے طبع آزمائی کی ہے۔کسی نے طویل نعتیہ قصیدے اور مثنویاں لکھی ہیں، کسی نے مختصر نعتیہ غزلیں اور رباعیات کہی ہیں۔کسی نے سیرت اور شخصیت کے اوصاف بیان کیے ہیں اور کسی نے معجزات و غزوات کو شعر کا موضوع بنایا ہے۔کسی نے نعتیہ شاعری کے پورے پورے دیوان یادگار چھوڑے ہیں اور کسی کے یہاں اکا دکا نعتیہ غزلیں نظر آتی ہیں۔کچھ نے اعلیٰ درجے کی شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں اور کچھ اوسط و ادنیٰ سے آگے نہیں بڑھ سکے۔لیکن اردو شاعری کی چار سو سالہ تاریخ میں نعتوں کا کتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہوگا، اس کا اندازہ ہر اس شخص کو ہوگا جس نے اردو شاعری کا تسلسل سے مطالعہ کیا ہے۔گرچہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس ذخیرہ کا زیادہ تر حصہ بعض دوسرے موضوعات کی شاعری کی طرح معمولی درجے کا ہے، لیکن ایک حصہ ضرور ایسا ہے جو فکر و فن کے معیاروں پر پورا اترتا ہے اور بلند پایہ شاعری کے زمرے میں آتا ہے۔

اردو میں نعت گوئی کی مقبولیت اور اس کی بے پناہ وسعت کے اسباب و محرکات پر جب ہم غور کرتے ہیں تو نعت گوئی کا اولین محرک مسلمانوں کا عقیدہ رہا ہے کہ رسول اکرمؐ کا ذکر اذکار کرنا، ان کی سیرت و شخصیت کو عوام الناس کو روشناس کرانا، ان کی پیروی و تقلید کی ترغیب دینا اور ان کے نام پر درود و سلام بھیجنا کار ثواب اور ذریعہ نجات ہے۔اور کار ثواب اور ذریعہ نجات کی خاطر تحریر و تقریر دونوں میں ہر شخص نے اپنی بساط بھر سیرت رسولؐ کو جگہ دینے کی کوشش کی شعر و سخن کے رسیا ذہنوں اور موزوں طبیعتوں کے لوگ نعت گوئی کرنے لگے۔

نعت گوئی کا دوسرا بڑا محرک رسول کریمؐ سے والہانہ عشق و محبت ہے چوں کہ ان کی فکر کا بنیادی عقیدہ توحید و آخرت، رسالت محمدیؐ کے توسل سے حاصل ہوا تھا۔ اس لیے جہاں اس عقیدے نے ان کی زندگیوں نے انقلاب پیدا کر دیا تھا، وہاں آپ کی ذات و شخصیت سے ایک فدا کارانہ محبت و شغف بھی پیدا ہو گیا تھا اور اتباع رسول نے حب رسول کی ایسی والہانہ صورت و کیفیت پیدا کر دی تھی جس کے بغیر یقین و عقیدہ کا ہر تصور بے معنی بن کر رہ گیا تھا۔ عشق رسول نے اس امت مسلماں کی زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ خاص طور پر ان کے فنون لطیفہ اور شعر و ادب پر گہرا اثر ڈالا۔ اس اثر کے نتیجے میں نعت کا فن، جس کا اصل مقصود آنحضرتؐ سے اظہار محبت کرنا اور آپ کی روشن زندگی سے فیضان حاصل کرنا تھا، ان کے شعر و ادب کا مرکزی مضمون اور محور بن گیا۔

نعت گوئی کا تیسرا بڑا محرک بعض علما و صوفیا کی وہ توجہ ہے جو انہوں نے نعت پر صرف کی ہے۔ ان بزرگان دین اور صوفیا کرام نے اعلیٰ درجے کی نعتیں بھی کہیں اور اپنے نعتیہ کلام کے مجموعے مرتب کیے، چوں کہ یہ سب اپنے شاگردوں، ارادت مندوں اور مریدوں کا ایک وسیع حلقہ بھی رکھتے تھے، اس لیے ان کی نعتیہ شاعری کو شہرت ملنے میں دیر نہ لگی۔ بعض شاگردوں اور مریدوں نے اپنے مرشد اور استاذ سے متاثر ہو کر خود بھی نعت گوئی اور نعت خوانی کو اپنا مشغلہ بنالیا۔ اس طرح صوفیائے کرام اور صوفی شعرا نے ہماری زندگی اور شعر و ادب دونوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اردو شاعری میں علائم و رموز کا جو بڑا ذخیرہ موجود ہے وہ زیادہ تر صوفی شعرا ہی کی دین ہے۔ اردو زبان و ادب کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کے جو عظیم کارنامے ہیں انہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب 'اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ' میں اس پر بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے لہٰذا شاعری پر تصوف کے اثرات بڑے گہرے پڑے ہیں۔ ولی دکنی سے لے کر جگر مرادآبادی تک شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کے یہاں صوفیانہ مسلک کی جھلک موجود نہ ہو، لیکن بعض شعرا میرؔ، دردؔ، مظہرؔ جان جاناں، آتشؔ، غالبؔ، امیر مینائیؔ، محسنؔ کاکوری، اصغرؔ گونڈوی کی شاعری پر تصوف کے اثرات گہرے اور واضح ہیں۔ ان کی شاعری میں عشق مجازی کو عشق حقیقی کے ہی رنگ میں دیکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نعت گو شعرا کے یہاں بھی مجازی و حقیقی رنگ ایک دوسرے میں اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ انہیں

الگ کر کے دیکھنا مشکل ہے۔

نعت گوئی کی مقبولیت اور وسعت کا ایک بڑا ذریعہ میلاد النبیؐ کی محفلوں کا انعقاد بھی رہا ہے۔اردو میں مختلف میلاد کی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں جس میں رسول کریمؐ کی سیرت وسوانح کے نثری اظہار کے ساتھ ساتھ شعری پیرائے میں بھی محبت وعقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔ان محفلوں میں نعت کے ساتھ درود وسلام بھی بڑے جوش وخروش سے بہ آواز بلند پڑھا جاتا ہے۔اس کے علاوہ سیرت النبیؐ کے جلسے بھی بہ کثرت منعقد ہوتے رہتے ہیں،جس میں تلاوت کلام پاک کے بعد نعت بھی پڑھی جاتی ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ شاعری کی کسی عام صنف سے مسلمان واقف ہو یا نعت کا نام اور اس کا اصطلاحی مفہوم سب جانتے ہیں۔نعت کی وسعت و مقبولیت کے ان اسباب کی روشنی میں جب ہم اردو نعت گوئی کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو شاعری کی ابتدا کے ساتھ ہی نعت گوئی کا آغاز ہوجاتا ہے۔قدیم دکنی شعرا سے لے کر آج تک جس تواتر وتسلسل کے ساتھ نعتیں کہی گئی ہیں،دوسری قسم کی نظمیں نہیں کہی گئی ہیں۔نعت کا تعلق موضوع سے ہے،کسی مخصوص ہیئت سے نہیں۔اس میں پابندی صرف اس صنف کے داخلی پہلو یعنی مواد اور موضوع کی ہوتی ہے، کیوں کہ رسول اکرمؐ سے متعلق مضامین کی اور التزام ہی نعت کہلاتا ہے،پیرایہ اظہار کچھ بھی ہو،موضوع کا یہ تعلق اور نسبت برقرار رہنی چاہیے کہ اس نسبت گرامی کی عدم موجودگی سے نعت،نعت نہیں رہے گی۔لہذا نعت کے لیے کسی سطحی ڈھانچے کی ضرورت نہیں۔اس کے لیے زبان وادب کے پیرایہ اظہار،طرز بیان اور ہیئت کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔نعت کے مضامین کو شاعروں نے کم وبیش تمام اصناف سخن میں قلم بند کیا ہے۔جو صنف شعر جس عہد میں زیادہ مقبول ومروج رہی ہے،اس صنف کو نعت کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔غزل چوں کہ آج ہماری شاعری کی مقبول ترین صنف ہے اور ہر دور میں اپنی داخلی خصوصیات اور ہیئت کے سبب پسندیدہ رہی ہے،لہذا نعت کے مضامین کے لیے بھی سب سے زیادہ غزل کی صنف مستعمل رہی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو شاعری میں نعتیہ کلام ہر عہد اور زمانے میں اپنے موضوع کی پاکیزگی اور عشق رسول کے جذبات سے معمور رہے۔ہر دور کے شعرا نے اس موضوع پر کچھ نہ کچھ اظہار خیال کیا ہے۔ اس سے اس صنف کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔اردو شاعری میں شعرا نے اس موضوع کو باضابطہ طریقے سے

صنف سخن کے اعتبار سے اس پر خصوصی توجہ دی ہوتی تو آج یہ صنف عربی نعتیہ کلام کی طرح فن کی بلندیوں تک پہنچ جاتی ۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اردو شاعری میں نعت گوئی کی جو طویل روایت رہی ہے اس وسیع تر امکانات آج بھی موجود ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی جانب ہمارے شعرائے کرام توجہ دیں ۔

مراثیِ انیسؔ میں انسان سازی کے عناصر

(تربیت اخلاق وکردار کے حوالے سے)

ڈاکٹر حسن مثنیٰ
صدر شعبۂ اردو رانچی کالج

مرثیہ نگاری نے اپنے اندر جہاں ایک طرف جملہ اصناف ادب کی لسانی، تہذیبی اور معاشرتی خصوصیات کو سموئے رکھا ہے وہیں اس میں انسان سازی کے عناصر بھی بکھرے پڑے ہیں خواہ وہ شجاعت و سخاوت ہو کہ اطاعت و فرمانبرداری یا پھر عفو وکرم۔احسان شناسی، حسن سلوک، صلہ رحمی، مہر و وفا، صبر و رضا، جذبۂ اتحاد و یگانگت، حلم و بردباری، سپاس گذاری اور انکساری وغیرہ عناصر ہوں کہ سرفروشی وحق و صداقت کی راہ میں سب کچھ نثار کر دینے کا جذبہ، باطل کے سامنے سر نہ جھکانا، مصیبتوں میں بھی اپنے مقصد کو مقدم جاننا، اور اس مقصد کی صداقت کا یقین محکم وغیرہ ایسی باتیں ہیں جن کا میر انیسؔ نے بھی اپنے مرثیوں میں بڑے ہی شدومد سے بیان کیا ہے اور انسان کو انسان بننے کے گر بتا گئے ہیں۔انیس کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے قلمرو میں ایسے ایسے جواہر پارے جمع کر دئے کہ اس کے مطالعے کے وقت ہم پر چودہ طبق روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔وجہ صرف یہ ہے کہ اس میں اولاد بنی ھاشم کے تقدس روحانیت اور علم واخلاق کا بیان ملتا ہے جو بہر حال بنی امیہ سے افضل تھے۔امام حسین کی سیرت زندگی کا مطالعہ کرنے سے بھی یہ واضح ہے کہ وہ انسان کامل تھے جو کربلا کے میدان میں اپنے ساتھ بہتر (۷۲) جواہر پارے لائے تھے جن میں نہ صرف انسان سازی کے جملہ اوصاف مجتمع تھے بلکہ انہوں نے اس کا بہترین مظاہرہ بھی کیا تھا۔اس طرح ہم ان شہ پاروں کا مطالعہ صرف کسی ادبی یا مذہبی صحیفہ کے طور پر نہیں کرتے بلکہ ہم اس سے انسان سازی کا، اعلیٰ اقدار کی پاسداری کا سبق بھی سیکھتے ہیں، جسے میں اپنی ناقص عقل وفہم میں یا اپنے محدود ادبی زاویۂ نگاہ میں اردو ادب کو ان کی عطا قرار دیتا ہوں کہ وہ اور ان کے قبیل کے کچھ افراد ہی یہ کارنامہ انجام دے پائے۔اردو کی تمام اصناف سخن میں مرثیہ ہی وہ صنف ہے جس میں ہر دور کے شاعر نے اخلاق وکردار کے ایسے ایسے شیڈس پیش کئے ہیں جس

کا مطالعہ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو ہمارے ہی سماج کے عکاس ہیں۔میرے خیال میں میر انیس ومرزا دبیر یا اسی قبیل کے دیگر شعراء یہ کارنامہ اس لئے انجام دے گئے کہ ان سبھوں نے اس واقعہ کو حد درجہ احترام اور خلوص کے ساتھ دیکھا اور برتا ہے۔

باپ بیٹے ،بھائی بھائی،ماموں بھانجے،چچا بھتیجے،چچا بھتیجی،ماں بیٹی،ساس بہو ،نند بھاوج،شوہر بیوی،دوست واحباب،آقا وغلام یعنی ہر رشتہ کو ان کی افتادطبع کے تئیں پیش کرنا اور اس طرح پیش کرنا کہ انکا اخلاق وکردار اجاگر ہو جائے نیز یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ان کی تربیت کن ہاتھوں میں اور کس نہج پر ہوئی ہے یہ مرثیہ نگاروں کے ہی بس کی بات تھی۔میں یہ دعویٰ صرف اس لئے کر پا رہا ہوں کہ اس سے قبل اردو کے شعری کائنات میں اخلاق وکردار کے علاوہ انسانی سازی کی ایسی عملی فضا کہیں اور نہیں تخلیق کی جا سکی ہے۔چہ جائیکہ ''بگڑا شاعر مرثیہ گو'' والی بے جا کہاوت یا مذہبی شاعری کے زیر اثر اس صنف سے شعوری طور پر بے اعتنائی برتی گئی ۔

میری نظر میں مرثیہ نگاری صرف شاعری نہیں ہے ،مذہب کی ترویج واشاعت کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ اسے ایک ''اخلاقی صحیفہ'' کہا جانا چاہئے کیونکہ اس میں اخلاق سازی وکردار سازی کا ایسا نظام نظر آتا ہے جو صرف اسی صنف سخن کا حصہ ہے۔ایسا اس لئے کہ میر انیسؔ نے نہ صرف بنی ھاشم کے جیالوں کو موضوع سخن قرار دیا ہے بلکہ انہیں بھی جو نہ صرف قافلۂ حسینی کے ساتھ ساتھ تھے بلکہ اصول اسلام کے علمبردار بھی تھے۔

اس سے قبل کہ مراثی انیسؔ میں تربیت اخلاق وکردار یا انسان سازی کے عناصر تلاش کئے جائیں بہتر یہ ہے کہ انیس کی افتادطبع اور ان کی پرورش وپرداخت اور تربیت نفس پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے کیونکہ کسی بھی ادیب وشاعر کی شاعری یا ادب اس کے اپنے تجربے کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔اسی لئے میر انیسؔ کے تعلق سے مجھے صالحہ عابد حسین کا یہ بیان صد فی صد حقیقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ:

> ''کسی اور شاعر کے لئے اچھے اخلاق کا انسان ہونا ضروری ہو یا نہ ہو مگر جو شاعر سماجی اصلاح یا اخلاق ومذہب کے اصولوں کی تبلیغ وتفسیر کرنا چاہے،کبھی بلند پایہ شاعر نہیں بن سکتا جب تک خود ان پر گہرا عقیدہ نہ رکھتا ہو اور اپنی زندگی میں حتی المکان ان کا پابند نہ ہو

خواتین کربلا کلام انیس کے آئینہ میں صفحہ 3 "۔

اس اقتباس سے تاثر لیتے ہوئے اگر میر انیسؔ کی افتادِ طبع پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے گا کہ وہ دہلی، فیض آباد اور لکھنؤ سے وابستہ ایک ایسے خانوادے کے چشم و چراغ تھے جہاں اخلاقی قدریں نہایت اہمیت کی حامل تھیں۔ ان کا گھرانہ شرافت و نجابت اور اخلاق و کردار میں یگانۂ روزگار تھا۔ ان کے دادا میر حسن اور والد میر خلیقؔ کی وضع داری کے سبھی قائل تھے، اور جب میر انیسؔ ان سب کے خمیر سے تیار ہوئے تھے تو ان میں بھی ان اعلیٰ اقدار کا گھر کر جانا لازمی ہی تھا۔ ہاں اس کو فروغ دینے میں، اسے پروان چڑھانے میں انکی والدہ کا بھی وقیع ترین حصہ تھا۔ اس پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جو ادب و آداب، طور و طریق، تہذیب و شائستگی، خودداری، شرافت، مذہبی عقیدت وغیرہ ان میں موجود تھی وہ ایک ماں کی تربیت کا ہی نتیجہ تھی۔ شاید اسی پس منظر کے تحت میر انیسؔ کے متعلق صالحہ عابد حسین نے کہا تھا کہ:

> ''میر انیسؔ کے یہاں ہمیں جو گہری عقیدت، خلوص اور جوش نظر آتا ہے وہ اس بات کا شاہد ہے کہ شاعر خود دل و جان سے ان قدروں پر ایمان رکھتا ہے جن کا وہ ذکر کر رہا ہے۔'' خواتین کربلا کلام انیس کے آئینہ میں صفحہ 3

میر انیسؔ نے اگر ایک عظیم موضوع کی مناسبت سے اپنے موئے قلم کو جنبش دی تھی تو اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ اس سے حسینی مشن کو استحکام بخشا جا سکے، اسے فروغ دیا جا سکے۔ اس کی ظاہری وجہ واقعہ کربلا پر ان کا عقیدہ بھی تھا۔ جس کا ذکر انہوں نے اپنے مرثیوں، سلاموں اور رباعیوں و قطعات میں بارہا کیا ہے۔

ابتدائے آفرینش سے دنیا میں بہت ساری جنگیں ہوئی ہیں، ہوتی رہیں گی اور شاید یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو لیکن جنگ کربلا ایسی واحد جنگ ہے جہاں انسان سازی کا عمل انجام دیا گیا، جہاں دشمن کو بھی عالم تشنگی میں سیراب کرنے کا سلیقہ سکھایا گیا، دشمن پر غالب آنے کے باوجود (جناب ہانی کے مکان ابن زیاد کو موقع رہتے ہوئے قتل نہ کرنا) اپنی جانب سے پیش قدمی نہ کرنا یہ حسینی شیوہ تھا، یہ حسینی اقدار تھے جس کی بدولت اس واقعہ کی یاد آج بھی ہمارے ذہنوں پر قائم ہے۔ اس کی ایک جھلک دو محرم سن اکسٹھ (۶۱) ہجری کو اس وقت بھی دیکھنے کو

بھی ملی جب امام نے دشت کربلا میں قیام فرمایا۔مورخ ابن اثیر تاریخ کامل میں لکھتا ہے کہ:

''جب امام حسین نے دشت کربلا میں قیام فرمایا تو زہر قین نے عرض کیا کہ یا ابن رسول اللہ قسم ہے خدا کی، دشمنوں کا جو برتاؤ آپ اس وقت ملاحظہ فرما رہے ہیں آئندہ اس سے زیادہ شدید ہوگا؛ اور ان موجودہ مخالفین سے قتال کرنا بہ نسبت ان لوگوں سے قتال کرنے کہ آسان ہے جو ان کے بعد آئیں گے کیونکہ اپنی جان کی قسم جو فوج کثیر اب آئے گی اس کے مقابلے سے ہم عاجز ہوں گے۔۔۔۔امام حسین نے جواب دیا: ہاں، یہ سچ ہے مگر میں لڑائی میں اپنی جانب سے پہل نہیں کروں گا۔''

اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں فیصلے تاریخی فیصلے تھے۔اس کی ایک وجہ امام عالی مقام کے ذریعہ ایسے پر آشوب حالات میں بھی قلب ماہیئت کے عمل کو انجام دینے کا ہنر سکھانا ہے، جس کی بہترین مثال ''حر'' ہے۔مراثی انیس کا مطالعہ کیجئے تو اس میں بھی ایسے کئی مناظر نظر آئیں گے۔یہاں صرف ایک منظر کہ جب کربلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا ''ناگہہ اٹھا شمال کی جانب سے اک غبار'' اور فوج یزید کی پلٹنیں آنے لگیں میر انیس کس انداز سے اپنی بات کہتے ہیں۔اسے تین مختلف اشعار سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔پہلے شعر میں ایک وسوسہ ہے تو دوسرے اور تیسرے اشعار میں ایک قسم کی حکمت عملی پر اتفاق رائے کہ امام عالی مقام نے پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ ہمیں جنگ میں سبقت نہیں کرنی ہے

مڑ کر کہا حبیب نے کچھ رنگ اور ہے
بولا کوئی یہ شام کے لشکر کا طور ہے
یک جا ہوئے یہ سن کے جوانان صف شکن
نکلا ہر اک ولی کی زباں سے یہی سخن

.....

اعدائے دیں کے شر سے حفاظت میں ہم رہیں
ناحق کوئی لڑے بھی تو ثابت قدم رہیں

میر انیس نے یہاں جوانان صف شکن کی ترکیب سے بہت ساری باتیں واضح کر دی ہیں لیکن چونکہ

انہیں ولی صفت دکھایا گیا ہے اس لئے وہ اپنے دشمن کو ''اعدائے دیں'' بتاتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہ ایسے میں بھی ثابت قدمی ان کا شعار ہونا چاہئے جیسا کہ امام عالی مقام بار بار ترغیب دے رہے ہیں کہ ''سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں''۔ میں یہاں صرف دو منظر پیش کرنا چاہوں گا جس نے مجھے حد درجہ متاثر کیا ہے۔ سب سے پہلے پیش ہے مکالمہ حر جس سے انسان سازی کے کئی پیغام عام کئے جا سکتے ہیں۔

ان کے احسان کا کیونکر کوئی منکر ہو جائے
سخن حق میں جو شک لائے وہ کافر ہو جائے

.....

حر سے گھبرا کے یہ بولا عمر سعد شریر　　یہ تو ہے صاف طرف داری شہ کی تقریر
اپنے حاکم کا نہ کچھ ذکر نہ تعریف امیر　　اللہ اللہ یہ اوصاف یہ مدح شبیر

سن چکا ہوں میں کہ مضطر ہے کئی راتوں سے
الفت شاہ ٹپکتی ہے تری باتوں سے

نہ وہ آنکھیں، نہ وہ چتون، نہ وہ تیور، نہ مزاج　　سیدھی باتوں میں بگڑنا یہ نیا طور ہے آج
تخت بخشا ہے محمد کے نواسے نے کہ تاج　　جن کو سمجھا ہے غنی دل میں وہ خود ہیں محتاج

کون سا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہے
کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے

میں جہاں دیدہ ہوں سب مجھ کو خبر ہے تیری　　قرۃ العینِ محمد پہ نظر ہے تیری
ہونٹ بھی خشک ہیں اور چشم بھی تر ہے تیری　　جسم خالی ہے ادھر جان ادھر ہے تیری

راہ میں کچھ جو سلوک اور نوازش کی ہے
تو نے فرزند یداللہ سے سازش کی ہے

خیر مخفی نہ رہے گا یہ قصور اور فتور　　لکھیں گے عہدۂ اخبار یہ جو ہیں مامور
حاکم شام ہے جابر، وہ سزا دیگا ضرور　　گر تجھے دار پہ کھینچے، تو کچھ اس سے نہیں دور

سب تری قوم کے سر تن سے جدا ہوئیں گے
زن و فرزند گرفتارِ بلا ہوئیں گے

حر پکارا کہ زباں بند کر او نا ہموار　　قابل لعن ہے تو اور وہ تیرا سردار
ابن زہرا ہے جگر بند رسول مختار　　میرا کیا منہ جو کروں مدح امام ابرار
اک زمانہ صفت آل عبا کرتا ہے
آپ قرآں میں، خدا ان کی ثنا کرتا ہے

اسفلوں سے ہے محبت تجھے اوسفلہ مزاج　　خاک پا اسکا ہوں میں، ہے جو سر عرش کا تاج
جسکو کاندھے پہ محمد کے ملی ہے معراج　　میرے آقا سا سخی کون ہے کونین میں آج
کیوں ترے سامنے مکروں کہ نہیں بخشا ہے
ہاں مجھے شاہ نے فردوس بریں بخشا ہے

باغ جو مجھ کو دکھایا ہے اسے کیا جانے گا تو　　راحت روح ہے جس باغ کے ہر پھول کی بو
مجھ کو اللہ نے بخشیں ہیں وہ حوریں خوش رو　　کہ جنہیں میرے فرشتوں نے نہ دیکھا ہو کبھو
نام کوثر کا نہ لے تو مجھے جوش آتا ہے
انہیں چھینٹوں سے تو بیہوش کو ہوش آتا ہے

عمل خیر سے بہکا نہ مجھے او ابلیس　　یہی کونین کا مالک ہے یہی راس و رئیس
کیا مجھے دے گا ترا حاکم ملعون وخسیس　　کچھ تردد نہیں کہہ دے کے لکھے پر چہ نویس
ہاں سوئے جانب شہنشاہ عرب جاتا ہوں
لے ستمگر، جو نہ جاتا تھا، تو اب جاتا ہوں

پہلا سین سپہ سالار یزید حر ابن ریاحی کا فوج یزید سے منحرف ہو کر امام کی خدمت میں بندھے ہاتھوں حاضر ہونا آپ نے ملاحظہ فرما لیا۔ اب یہیں پر ایک اور روایت پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ یہ منظر جنگ کربلا سے قبل اس آخری تقریر کا ہے جس میں امام نے شب عاشورہ اپنے اصحاب سے کہا تھا کہ ''میں اپنی بیعت تمہاری گردنوں سے اتارتا ہوں اور تم جہاں چاہو چلے جاؤ۔'' تقریر کا اہم اقتباس ابن خلدون کے حوالے سے پیش ہے:

''تمام تعریفیں خدا کے لئے ہیں۔ میں دنیا میں کسی کے ساتھیوں کو اتنا جاں باز اور وفا شعار نہیں سمجھتا جتنا کہ میرے ساتھی ہیں اور نہ دنیا میں اتنے نیک اعزہ کسی کو ملے جیسے

نیک اور وفادار میرے اعزہ ہیں۔خدا تمہیں اجر عظیم دے۔آگاہ ہو کہ دشمن کل ضرور جنگ کرے گا۔میں بخوشی اجازت دیتا ہو کہ تمہارا جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔میں ہرگز مزاحم نہیں ہوں گا۔شامی محض میرے خون کے پیاسے ہیں۔اگر وہ مجھے پالیں گے تو دوسروں کی تلاش نہیں کریں گے۔''

بحوالہ شہید انسانیت، مرتبہ ادارۂ تحریری مرکزی سیزدہ صد سالہ یادگار حسینی لکھنؤ صفحہ 325

امام کا یہ کہنا کہ وہ انہیں تنہا چھوڑ کر چلے جائیں کہ یزید کو ان کے سر کی ضرورت ہے نہ کہ وہ ان اصحاب کے قتل پر آمادہ ہے جو معرکہ حق و باطل میں ان کے ساتھ ہیں۔روایت ہے کہ اس تقریر کے بعد امام نے تمام شمع گل کرا دئے کہ کسی کو شرم دامن گیر نہ ہو۔امام کا یہ اقدام بھی اپنی نظیر آپ ہے لیکن حسینی جیالوں کا شمع گل ہو جانے کے بعد تلوار نیام سے باہر نکال لینا، اپنا سر اپنی تلواروں سے قلم کر لینے پر آمادگی کا اظہار کرنا ایک ایسا منظر پیش کرتا ہے جسے انسان سازی کا بہترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہاں جذبۂ وفاداری، جذبۂ شجاعت، جذبۂ صبر و شکر اور حق پسندی سبھی کچھ اپنے عروج پر ہے۔چہ جائیکہ باطل پرستی کا صلہ ''ملک رے'' کا انعام تھا۔دیکھیں اصحاب حسین میں سے جناب سعید بن عبد اللہ حنفی کے یہ الفاظ جس میں جوش شہادت اور ولولہ سرفرازی اپنے عروج پر ہے:

''خدا کی قسم ہم آپ کا ساتھ ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔بخدا اگر میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں، پھر جیتے جی جلا دیا جاؤں، پھر میری خاک ہوا میں منتشر کی جائے اور یہی میرے ساتھ ستر مرتبہ سلوک ہو تو بھی میں آپ سے جدا نہ ہوں گا۔یہاں تک کہ آخری موت مجھے آپ کے قدموں پر آئے۔''

بحوالہ شہید انسانیت، مرتبہ ادارۂ تحریری مرکزی سیزدہ صد سالہ یادگار حسینی لکھنؤ صفحہ 327

اگر ہم کلام انیسؔ کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں تو ہمیں یہ احساس ہوگا کہ اس عالم غربت میں بھی زندگی کی تمام اعلیٰ اقدار کو سینے سے لگائے رکھنے کا جوہر پیش کیا گیا ہے۔اگر اس کی مثالیں امام کے بوڑھے دوست حبیب ابن مظاہر کی مہمان نوازی کے لئے ان کے دل میں موجود تڑپ میں موجزن نظر آتی ہے تو دوسری جانب

دستۂ حر کے پیاسے سپاہیوں اور حیوانوں پر ترس کھانا، انہیں سیراب کرنا بھی وطیرۂ حسین ہی ہو سکتا ہے۔۔۔ کیونکہ ان سبھی کی پیاس کے مارے جان پر بن آئی تھی۔ بقول میر انیسؔ ''منہ سے باہر نکل آئی تھیں زبانیں سب کی''۔ یہ وہی حر ہے جو ایک ہزار کے فوجی دستہ کے ساتھ امام کا راستہ روکنے کے لئے آیا تھا، لیکن ساقیِ کوثر سے کرم کی بھیک مانگ رہا ہے۔ دیکھیں یہ بند:

کوسوں گئے پانی کے تجسس میں ہوا خواہ		جز خاک، نہ چشمہ کہیں دیکھا، نہ کہیں چاہ
دس سو ہیں سواران عراقی مرے ہمراہ		بے موت مرے جاتے ہیں سب یا شہ ذیجاہ
اب جان نہ اسواروں میں، گھوڑوں میں نہ دم ہے
اے ساقیِ کوثر کے پسر وقت کرم ہے

حر کے رسالے کا یہ حال کچھ یوں ہی نہیں ہو گیا تھا۔ دراصل ہوا کچھ یوں تھا کہ جب امام کو گھیر کر لانے کے لئے چاروں طرف سے ناکہ بندی کر دی گئی تو امام نے اپنی منزل پر پہنچنے کے لئے راستہ بدل دیا تھا جس سے ان کا پیچھا کرنے میں حر کی فوج کو کافی تگ و دو کرنی پڑی تھی، عرب کے ریگستان میں بغیر پانی لئے انہیں بہت تیز چلنا پڑا تھا جس سے فوجی اور گھوڑے سبھی پیاس سے جاں بلب تھے۔ امام اپنے اصحاب سمیت کھڑے تھے کہ وہ سبھی سد راہ ہوئے سخی ابن سخی سے خلق خدا کی پیاس نہ دیکھی گئی۔ حضرت عباس کی طرف مڑ کر ان کا یہ دریافت کرنا کہ ''مشکوں والے ہیں کہاں، اونٹ ہیں پانی کے کدھر'' اور پھر یہ حکم بھی کہ ''جتنا پانی ہے وہ پیاسوں کو پلا دو بھائی'' ایک عجیب سی شان رکھتا ہے۔ آپ نے اپنے جوانوں کو صرف یہ حکم نہیں دیا کہ انہیں پانی پلاؤ بلکہ یہ حکم دیا کہ اس وقت تک پلاؤ جب تک سب سیراب نہ ہو جائیں ساقیِ کوثر کے پسر کی سقائی اس شان دلیرانہ کی یاد بھی دلا دیتی ہے جو کہ اس سے قبل ان کے دونوں بھائیوں نے پہلے بھی انجام دی تھی [۱]۔ واضح رہے کہ پانی کا یہ ذخیرہ امام نے مقام ''سراۃ'' میں اپنے خانوادے و اصحاب کے لئے اس وقت کیا تھا جب انہوں نے شاہراہ عام سے ہٹ کر چلنے کا فیصلہ لیا کہ عرب میں آج بھی بے راہہ راستے میں پانی کی عدم فراہمی کا خدشہ ہوا کرتا ہے۔ یہاں انیسؔ کی زبانی امام عالی مقام کی سخاوت کا یہ انداز بھی ملاحظہ فرمائیں جس سے نہ صرف لطف دوبالا ہو جائے گا بلکہ ہمیں ایک ابدی پیغام بھی ملے گا:

رہ نہ جائے کوئی گھوڑا کوئی ناقہ بے آب　　چھاگلیں جلد منگاؤ ،مرا دل ہے بیتاب
سقے مشکیزوں کے منہ کھول کے آپہنچے شتاب　　متوجہ ہوا میں خود کہ، وہ تھا کار ثواب

چین آیا نہ مجھے بے انہیں آرام دئے
تھا جو اک جام کا پیاسا، اسے دو جام دئے

جناب حر کا کردار سرزمین کربلا کا ایک ایسا کردار ہے جس کے حوالے سے اخلاق و کردار کی کئی تہوں سے پردہ اٹھتا ہے۔یہ کردار اگر ایک طرف ہماری کردار سازی کرتا نظر آتا ہے تو دوسری طرف یہاں حر کی حق شناسی ،اس کا انداز ندامت ،اس کا جذبہ شجاعت ،اس کا شوق شہادت اور اس میں موجود تسکین قلب اور عقل و خرد قابل رشک ہے۔شاید اسی لئے وہ تاریخ جنگ کربلا میں ایک ایسی زبردست اخلاقی قوت کا استعارہ بن جاتا ہے جس کی نظیر پوری تاریخ انسانیت میں نہیں ملتی۔اسی لئے میر انیس حر کی زبانی کہتے ہیں کہ اب وقت کی پکار یہ ہے کہ خود کو حسین کے خادموں شمار کرالیا جائے۔ان کے جیالے اصحاب پر اپنی جان نچھاور کر دی جائے۔اسے یہ معلوم ہے کہ شہنشاہ والا کی باگ پر ہاتھ ڈالنے کا گناہ اس سے سرزد ہو چکا ہے اور نجات اسی میں ہے کہ سر کاٹ کے حسین کے قدموں میں ڈال دیا جائے۔

ڈالا تھا ہاتھ کیوں شہ والا کی باگ پر
سر کاٹ کے حسین کے قدموں میں ڈال دو

شاید اسی سوچ کے زیر اثر وہ امام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ فرزند رسول ''میں'' سب سے پہلے آپ سے لڑنے کو آیا تھا، میں ہی آپ کے سد راہ ہوا تھا لہٰذا ''مجھے'' سب سے پہلے اجازت دیجئے کہ سب سے پہلے میں ہی فوج یزید سے مزاحمت کروں حتیٰ کہ جان جان آفریں کے سپرد کر دوں۔شاید یہی وجہ ہے کہ حر میدان کربلا کا پہلا شہید قرار دیا گیا۔حر میں یہ تبدیلی یوں ہی نہیں آئی ہے، یہ قلب ماہیت کا معجزہ یوں ہی نہیں پیش آرہا ہے بلکہ اسے امام عالی مقام کے ایک اشارے میں پنہاں جاننا چاہئے کہ وہ جس کے خلاف آمادۂ جنگ ہے، جسے اس نے اس بیابان میں گھیر کر موت کے منہ میں ڈھکیلنے کا کام کیا ہے، اسی نے نہ صرف ہماری جان بچائی ہے۔بلکہ اتنے بڑے گناہ کے باوجود اس کے دربار میں عفو و کرم کا ایسا دریا موجزن ہے جس

کے صلے میں اس کی نجات کا سامان بھی ہوگیا۔اور جب امام کو یہ معلوم ہوا کہ حر اپنی غلطی پر نادم بلکہ شرم سار ہے تو ''خود بڑھے ہاتھوں کو پھیلائے ہوئے شاہ امم'' کہ اسے مزید ندامت اور شرمساری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔دیکھیں یہ بند:

حُر نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں پیدل شبیر　　دوڑ کر چوم لئے پائے شہ عرش سریر
شہ نے چھاتی سے لگا کر کہا اے با توقیر　　میں نے بخشی میرے اللہ نے بخشی تقصیر
میں رضا مند ہوں کس واسطے مضطر ہے تو
مجھ کو عباس دلاور کے برابر ہے تو

اس واقعہ میں امام حسین کا جذبۂ رحم، جذبۂ مہمانی، جذبۂ شفقت، جذبۂ عفو و درگزر وغیرہ اعلیٰ ترین اخلاق کا نمونہ ہیں۔امام حسین کا حر کو اپنے بھائی عباس دلاور کے برابر رتبہ بخشنا نہ صرف اسے شرمساری سے بچانے کا، اسے دلاسہ دینے کا ایک طریقہ ہے بلکہ اسے ایک مہمان کے خیر مقدم کا نرالا انداز بھی کہہ سکتے ہیں، اسے اس کی عزت افزائی کا ایک ہنر بھی قرار دے سکتے ہیں۔ورنہ ایسے پر آشوب ماحول میں امام عالی مقام کیونکر اسے اپنے قدموں سے اٹھا لیتے نیز جناب حبیب ابن مظاہر بھی اسے گلے لگا کر استقبال کرتے نظر نہیں آتے، اور نہ ہی حر کے جوان بیٹے ''علی ابن حر'' کا استقبال امام حسین کے بیٹے علی اکبر کے ذریعہ کیا جاتا۔ اسی طرح اس کے بھائی کو جناب عباس گلے لگا کر اس احساس ندامت سے نہ بچا لیتے جس سے وہ سبھی گزر رہے تھے، سب سے بڑی بات تو یہ کہ حر کے غلام کا استقبال اس وقت کے امام کے ذریعہ نہ کیا جاتا۔کیا اسے امام عالی مقام کے بے مثال اخلاق اور عظیم کردار پر منتج نہیں کیا جا سکتا ہے، اس عمل سے سبق نہیں سیکھا جا سکتا۔واقعہ کربلا میں نو محرم کو ہی جنگ کا سمان تھا لیکن امام عالی مقام نے ایک رات کی مہلت ہی شاید اس لئے لی تھی کہ انسان سازی کا نمونہ پیش کیا جا سکے، نیز یہ بھی کہ امام عالی مقام کو حر میں آئی اس تبدیلی کے عوض بطور انعام جنت جو عطا کرنی تھی۔تبھی تو شاعر نے حر کی زبانی کچھ یوں اظہار ممنونیت کیا اور کہا کہ:

جان شبیر روز جزا بخش دیجئے
وہ باگ تھامنے کی خطا بخش دیجئے

امام نے اپنے ناصر کی یہ خواہش پوری بھی کی اور جب اس کی لاش میدان سے لاکر ان کے سامنے رکھی گئی تو آپ نے حر کے چہرے سے خاک وخون کو صاف کیا اور ان سے متعلق یہ جملے ارشاد فرمائے:

''تم بے شک حر ہو۔ تمہارے والدین نے تمہارا نام حر بہت ٹھیک رکھا تھا۔ تم دنیا میں بھی حر ہو اور آخرت میں بھی حر۔''

بحوالہ شہید انسانیت، مرتبہ ادارہ تحریری مرکزی سیزدہ صد سالہ یادگار حسینی لکھنؤ صفحہ 408

اس قول سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی حریت وشرافت ہی سے اس کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں جس سے انسانی اقدار کی بقا کا سامان تو ہو ہی جاتا ہے، آخرت کا بھی۔ جبھی تو میر انیسؔ نے کچھ یوں اظہار خیال کیا:

حر کو چونکا کہ حبیب ابن مظاہر نے کہا
آپ بے تاب ہیں اے حر جری ہوش میں آ

اس واقعہ کا فریم بدلئے اور وہ وقت یاد کیجئے جب حر کی شہادت واقع ہو جاتی ہے تب اس جری پر کوئی رونے والا نہیں ہے، کوئی بین کرنے والا نہیں ہے وجہ ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ اس کا بھائی اور غلام بھی شہید ہو چکے ہیں کوئی ایسا رشتہ دار بھی نہیں ہے جو اس پر آہ وفغاں کرے، اس پر آنسو بہائے جیسا کہ اس وقت کے عرب میں جری افراد کی خوبیاں اور انکے کارنامے یاد کر کے ماتم کرنے کا چلن رائج تھا ہاں! یہاں امام حسین اور جناب زینب ہی ایسے ذوات مقدسہ ہیں جو اس کے غم پر آنسو بہاتی ہیں، انہیں کے خیمہ سے نالہ وشیون کی آواز آتی ہے۔ اسے حر کی اس جرأت مندانہ کارگزاری کا بدلہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے جو اس نے فوج یزید سے منحرف ہو کر کیا تھا۔ بقول میر ببر علی انیسؔ:

زہرا کی بیٹیاں حر ذیشاں کو روئیں گی
سیدانیاں حضور کے مہماں کو روئیں گی

.....

کسی آقا نے کبھی کی ہے یہ توقیر غلام
دیکھ تو رحم ترے واسطے روتے ہیں امام

خانوادۂ رسول کے اس عمل کو آپ کس امر پر محمول کریں گے یقیناً اسے انکساری، صبر، عفو و کرم اور درگزر کرنے کا جذبہ ہی کہا جائے گا جسے انسان سازی کا ایک اہم رکن تصور کیا جاتا ہے۔ کلام انیسؔ میں اس قسم کی بے شمار مثالیں مل جائیں گی جن سے سبق لے کر کسی بھی شخص کی تربیت و تعمیر میں اہم کردار ادا کیا جا سکتا ہے۔ شاید اسی بناء پر پروفیسر اعجاز حسین اور صفدر آہ جیسے ناقدین میر انیسؔ ان کی شاعری کے متعلق کچھ اس طرح رطب السان ہیں:

''ان کے تمام کلام میں بلند اخلاقی کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہے۔ یہ اخلاق و نصائح کی کتاب اور وعظ و پند کے ذریعہ ممکن نہیں۔''

اعجاز حسین: اردو شاعر کا سماجی پس منظر، الہ آباد 1968 صفحہ 241

''ان مراثی نے ایک اخلاقی نظام کی تبلیغ کی ہے اور اس نظام کی قدریں ایسی مکمل اور آفاقی ہیں جو ہر مقام اور ہر زمانے میں انسانی سیرت کی طہارت کا کام انجام دے سکتی ہیں۔''

سید صفدر آہ: نگار اصناف سخن نمبر، جنوری 1957 صفحہ 111

آیئے اب ایک اور منظر کہ جب امام حسین کا قافلہ چھ ماہ کے صبر آزما سفرِ مشقت کے بعد وارد کربلا ہوتا ہے اس وقت خیام حسینی نصب کرنے کے لئے فرات کی ترائی سے بہتر کوئی اور جگہ نظر نہیں آتی ہوتا تو یہ چاہئے تھا کہ جو جگہ سب سے بہتر ہو وہاں خیمے نصب کر لئے جائیں لیکن حفظ مراتب اور ادب و آداب کا لحاظ دیکھئے کہ بغیر اجازت خیمہ نصب کرنا کیونکر ممکن ہو پاتا۔ اسی لئے انیس نے یہ بیت کہی کہ:

بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباس نامور
خیمہ کہاں بپا کریں یا شاہ بحر و بر

چہ جائیکہ اس موقع پر ''حضرت نے مسکرا کے یہ ہر ایک سے کہا۔۔۔ دیکھو تو کیا ترائی ہے، کیا نہر، کیا فضا'' یعنی اس طرح قافلۂ حسینی کے ہر شخص پر یہ واضح ہو گیا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں قیام کرنا ہے لیکن اس موقع پر بھی امام جواب دیتے ہیں کہ اس امر میں بہنا زینب سے مشورہ کر لیں یعنی زینب جہاں کہیں وہیں خیمہ بپا کیا

جائے، مشورہ اس لئے کہ آج بھی ہمارے یہاں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ عالم سفر میں عورتوں کو کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئے۔ کلام میر انیسؔ کا یہ پہلو صرف اس لئے پیش کیا گیا کہ یہاں بھی بھائی بہن کے باہمی انداز مشورہ، حدِ ادب اور احترام بزرگاں ملحوظ رکھنے پر توجہ مبذول کرائی جا سکے ساتھ ہی سامعین و قارئین پر ایک ایسا ان مٹ نقش ثبت کیا جائے کہ وہ اسی سے انسان کی کردار سازی کا سبق سیکھ سکیں۔

پیچھے ہٹے یہ سنتے ہی عباسِ با وفا
جا کر قریب محملِ زینب یہ دی صدا
حاضر ہے جاں نثار امام غیور کا
برپا کہاں ہو خیمۂ اقدس حضور کا

لیکن پاس ادب و احترام کا یہ نرالا انداز ملاحظہ فرمائیں کہ جناب زینب یہ کہہ کر اپنے اختیار سے دستبردار ہو جاتی ہیں کہ ''اتر وہاں جہاں میرے بھائی کو چین ہو''۔ اسی اثنا میں یزیدی فوج کا سپہ سالار انہیں دریائے فرات کے کنارے سے خیمہ ہٹانے پر مجبور کرتا ہے۔ جناب عباس کو جلال آجاتا ہے، وہ ایک خط کھینچ کر دشمن کو آگے نہ بڑھنے کے لئے چیلنج کرتے ہیں، صورتحال بدل جاتی ہے یعنی ایک ہنگامی صورتحال پیدا ہو گئی ہے۔

ایسے موقع پر امام انہیں غصہ پی جانے کی ترغیب دیتے ہیں، غصہ کی وجہ سے جناب عباس کے بدن میں رعشہ ہے، چہرہ سرخ ہے اور جسم پسینہ سے تر بتر لیکن حکم امام اور بہن زینب کی قسم نے انہیں روک لیا ہے لیکن ان کی گردن جھکی ہوئی ہے اور آنکھوں میں خون کے ڈورے پڑے ہوئے ہیں۔ اس خلش کو دور کرنے کے لئے، غصہ کو فرو کرنے کے لئے امام حسین نے حضرت عباس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کہا کہ تم شیر ہو اور تمہاری دھاک کی وجہ سے کوئی ترائی میں قدم نہیں رکھے گا اس میں کوئی شک نہیں لیکن ہمیں یہاں صبر کے جوہر پیش کرنا ہے جنگ کی معرکہ آرائی نہیں۔ جنگ کی معرکہ آرائی تو جناب عباس جنگ صفین میں دکھا ہی چکے ہیں اسی کا اثر ہے کہ فوج یزید اس خط کو عبور کرنے کی ہمت نہیں کرتی ہے جو انہوں نے غصہ میں زمین پر کھینچ دی ہے۔ مراثی انیسؔ چونکہ ہندوستانی مزاج میں رچے بسے ہوئے شاعر کا تخلیق کردہ ہے اس لئے بھی اس میں ایسے سنگین مواقع پر امن و شانتی روا رکھنے پر زور دیا گیا ہے۔ انیس کا یہ انداز ہندوستانی مزاج کی عکاسی کرتا ہے کہ ہم دشمنوں کو زیر کر لینے کو ہی بڑا کارنامہ نہیں سمجھتے بلکہ اس کی خطاؤں کو معاف کر دینا بھی جنگ جیتنے کے سمان سمجھتے ہیں۔

ہمارے سمراٹ اشوک اس کی سب سے عمدہ مثال ہیں کہ انہیں جنگ جیتنا بھی آتا ہے اور دلوں کو جیتنا بھی۔انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کردیا کہ ہم دونوں جانب کے افواج کی جان بچانے کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں نہ کہ قتل و غارتگری کو۔ہاں ہم اصولوں کی خاطر جان کی بازی لگانے سے نہیں چوکتے ،یہ جذبہ ہماری شجاعت اور قومی وراثت کا اہم حصہ ہے۔اگر امام حسین جناب عباس کو لشکر اشقیاء سے نہر فرات کے قریب خیمہ نصب کرنے کے معاملے میں صلح کیشی اختیار کرنے اور صبر وضبط سے کام لینے کا حکم دیتے ہیں تو اسے کس طور انگیز کیا جانا چاہئے۔ حضرت عباس کے جذبات کی کیفیت اور ادب وتعظیم کا عالم اس بند میں دیکھئے اور انیسؔ کی خلاقانہ بصیرت کی داد دیجئے کہ وہ انسان سازی کے پیغام کو کس حد تک عام کرنا چاہتے تھے:

آقا نے دی جو اپنے سر پاک کی قسم　　بس تھرتھرا کے رہ گیا وہ صاحب کرم
پر تھی شکن جبیں پہ نہ ہوتا تھا غیظ کم　　چپ ہو گئے قریب جب آئے شہ امم
گردن جھکا دی تا نہ ادب میں خلل پڑے
قطرے لہو کے آنکھ سے لیکن نکل پڑے

آیئے اب جناب زینب کے حوالے سے بات کی جائے جو رسول اسلام کی بڑی نواسی ہیں،حضرت علی جیسے شجاع، جناب فاطمہ جیسی صابر وشاکر رسول زادی کی بیٹی ہیں۔واقعہ کربلا کا یہ ایسا کردار ہے جس نے میدان عمل میں صبر وشکر کے ایسے ایسے جوہر دکھائے ہیں کہ تاریخ انسانیت میں اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔اس کا ثبوت اس وقت بہم پہنچتا ہے جب انہوں نے اپنے دو نوخیز بیٹوں کو اپنے بھائی اور امام وقت کی نصرت کے لئے قربان کردیا اور اف تک نہ کیا بلکہ سجدۂ شکر بجالائیں۔لیکن وہی زینب جب اپنے بھائی کے مصائب وآلام پر بے اختیار آنسو بہاتی ہے تب ان کی محبت اور فداکاری ہمیں ملیک عظیم پیغام دے جاتی ہے

کیا اس قسم کے کردار ہمیں تاریخ کربلا کے علاوہ کہیں اور مل سکتے ہیں۔میرے خیال میں عون ومحمد سے متعلق مرثیہ انیسؔ کا ایک ایسا مرثیہ ہے جس میں انہوں نے حسینی جیالوں کے کرداروں کی اخلاقی جرأت اور جذبات کی بخوبی نشاندہی کی ہے۔یہاں شاعر کا تخیل فطرت انسانی کا ایسا نمونہ پیش کرتا ہے جسے کوئی دردمند دل رکھنے والا فطرت شناس ہی بیان کرسکتا ہے۔اس مرثیہ میں میر انیسؔ نے دکھایا ہے کہ دادا،اور نانا دونوں ہی

طرف سے ان بچوں کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ فوج حسینی کے علمدار بنیں اور ان کی معصوم معصوم سی خواہش بھی یہی ہے کہ کاش ایسا ہو جائے ۔علم اسلام اپنی آب و تاب کے ساتھ خیمہ کے باہر رکھا ہوا ہے ۔بنی ہاشم کے جیالے اور تمام اعوان و انصار اس فکر و فراق میں ہیں کہ دیکھیں علم کسے ملتا ہے ۔جناب زینب کے دونوں بچے بھی فوجی لباس میں آراستہ ہیں نہایت رعب و دبدبہ کے ساتھ علم کے پھریرے کو چوم کر اس کے اطراف پھرنے لگتے ہیں ۔انداز کچھ یوں ہے کہ ''گہہ ماں کو دیکھتے تھے کبھی جانب علم'' دعویدار ئی علم مانع پاس و ادب ہے اس لئے اشاروں اشاروں میں مدعا واضح کرنے کی سعی کی جاتی ہے ۔بقول میر انیسؔ '' آہستہ پوچھتے کبھی ماں سے وہ ذی حشم /اماں کسے ملے گا علم نانا جان کا'' پہلے مصرعے میں بچوں کا تجسس اور دوسرے مصرعہ میں 'نانا جان'' میں یہ رمز پوشیدہ ہے کہ وہ دونوں اپنے تئیں خود کو علم کا حقدار سمجھتے ہیں ۔ماں اپنے نونہالوں کے جذبات بھانپ لیتی ہے، وہ دیکھ رہی ہے کہ اس وقت ان کے تیور ہی اور ہیں ۔یعنی:

تیغیں کمر میں دوش پہ شملے پڑے ہوئے
زینب کے لال زیر علم آ کھڑے ہوئے
آنکھیں ملیں علم کے پھریرے کو چوم کر
رایت کے گرد پھرنے لگے جھوم جھوم کر

یہاں خواہش سے مغلوب بچوں کے طور و طریق میں تبدیلی صاف صاف محسوس کی جا سکتی ہے ۔ بقول میر انیسؔ ''وہ خوش مزاجیاں نہ تو وہ باتوں کے طور ہیں'' جوش و جذبہ اور غیظ و غضب نے اخلاق و مزاج کو کسی حد تک خشک بنا دیا ہے کہ اب انہیں کماندار بننا ہے ۔یہاں بچوں کے اندر فوجی کمانڈر کا سا عزم محکم (Confidence) نظر آ رہا ہے ۔ان دونوں کو اس انداز میں پیش کرنا بھی انیس کے فن کا کمال ہے لیکن یہاں ایک جری ماں کا فیصلہ کن انداز ملاحظہ فرمایئے جس میں انسان سازی اور اخلاق و کردار کے انمول رتن پوشیدہ ہیں ۔

بگڑوں گی میں جو لوگے زباں سے علم کا نام
.....
سرکو، ہٹو، بڑھو، نہ کھڑے ہو، علم کے پاس

.....

ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں شاہ فلک اساس

.....

رونے لگو گے پھر جو برا یا بھلا کہوں
اس ضد کو بچنے کے سوا اور کیا کہوں

.....

لازم ہے سوچ غور کرے پیش و پس کرے
جو ہو سکے نہ کیوں بشر اُس کی ہوس کرے
رخصت طلب اگر ہو تو یہ میرا کام ہے
ماں صدقے جائے آج تو مرنے میں نام ہے

.....

تم کیوں کہو کہ لال خدا کے ولی کے ہیں
فوجیں پکاریں خود کہ نواسے علی کے ہیں

مادر گرامی کی ایماء پر خواہش سے باز آنا، اپنے حق سے دستبردار ہو جانا پاسِ ادب ولحاظ بزرگاں اور جذبۂ احترام کا مظاہرہ کرتا ہے۔ظاہر ہے یہ ایک ایسی معصوم خواہش ہے جس سے انہیں اپنی بلند حوصلگی ثابت کرنی تھی، اپنی شجاعت کا اظہار کرنا مقصود تھا لیکن میر انیسؔ نے اسی حوالے سے عون ومحمد اور جناب زینب کی عالی نفسی اور ان کی اخلاقی جرأت پر روشنی ڈالی ہے۔یہاں ماں کی بیٹوں کو نصیحت، ایثار و بے نفسی اور میدان میں داد شجاعت پانے کی تلقین کرنا انہیں بلند حوصلہ بنا کر، فرمانبردار بنا کر پیش کرنا انیس کا کمال تو ہے ہی اس اخلاقی سیرت وبصیرت پر بھی روشنی ڈالتا ہے جو انہیں کا حصہ ہے۔

میر انیسؔ ایک باکمال مزاج شناس ہیں جس نے عورتوں کے منہ سے اس کے مزاج سے میل کھاتی ہوئی بات کہی ہے تو بچوں کے دہن سے بچوں کے ذہن کے مطابق خیال پیش کیا ہے، جری و بہادر ساونت کو اسی طور وطریق اور تیور کے ساتھ پیش کیا ہے، حتیٰ کہ انہوں نے ظالم کو بھی اس کی ذہنی نہج کے مطابق استوار کیا ہے جو کہ ان کے فن پر دلالت کرتا ہے۔پیش ہے یہ مکالمۂ زینب جو میرے موقف کی تائید کے لئے کافی ہے۔

اس کا نہیں خیال کہ کیونکر جیئے گی ماں　　ہوتا ہے آفتوں میں محبت کا امتحان
تم میری دس برس کی ریاضت ہو میری جاں　　ہو تا ہے آفتوں میں محبت کا امتحان

جس پر یہ برہمی ہے وہ سب جانتی ہوں میں
غصے کی آنکھ کا ہے کو پہچانتی ہوں میں

یا پھر یہ انداز کہ:

میں لٹ رہی ہو ں اور تمہیں منصب کا ہے خیال
ماں پر یہ آفتیں ہیں یہ ماموں پہ ظلم و جور　　پیارو ہمارے حال پہ لازم ہے تم کو غور
نازک مزاجیوں کے کسی دن نہ تھے یہ طور　　اب مشورے ہیں اور تصور ہیں اور اور

وہ دل نہیں وہ آنکھ نہیں وہ نظر نہیں
اوروں کا ذکر کیا تمہیں میری خبر نہیں

یعنی تم کو علم کی ہوس نے ایسا بے حواس کر دیا ہے کہ تمہیں میری فکر نہیں۔ یہاں سچی مامتا کی آواز نے جذبہ رحم کو ابھارا ہے، اور اسی پس منظر میں جذبہ ندامت اور جذبہ محبت بھی کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ دیکھیں یہ انداز:

ہاتھوں کو جوڑ جوڑ کے بولے وہ لالہ فام
غصہ کو آپ تھام لیں یا خواہر امام

.....

فو جیں بھگا کے گنج شہیداں میں سوئیں گے
تب قدر ہو گی آپ کو جب ہم نہ ہوئیں گے

.....

چھا تی بھر آئی ماں کی کہا تھام کر جگر
کیا صدقے جا ؤں ما ں کی نصیحت بُری لگی
بچوں یہ کیا کہا کہ جگر پر چھری لگی

اب لشکر حسینی کا علم بہن کے مشورے سے امامؑ نے یہ کہہ کر عباسؑ کو سونپا کہ ''لو بھائی لو، علم یہ امانت بہن کی ہے''، یعنی عباس حسینی فوج کے علمدار تو بن گئے لیکن عون و محمد کے چہرے کے رنگ متغیر ہونے لگے ایسے میں

جناب زینب نے اپنے ایک اشارے سے وہ کام کیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی ''انگشت رکھ کے دانتوں میں ماں نے کہا کہ ہا!'' اسی پر بس نہیں بلکہ انہوں نے بچوں کو ایسی قسم دے دی کہ وہ پھر کبھی اس پر توجہ ہی نہیں دے سکتے۔ یہاں میر صاحب نے اردو کے دو حروف تہجی 'ہ' اور 'ا' اور ایک استفہامیہ نشان سے قیامت ڈھا دی ہے۔ دیکھیں یہ اشعار جس ان کے مندجہ بالا Expression اور موقف کی مزید تائید ہو جائے گی۔

دیکھو سنیں نہ زوجۂ عباس با وفا
اچھا یہ ہے خوشی کی جگہ یا گلے کی جا

.....

لو اپنے دودھ کی تمہیں دیتی ہوں میں قسم　　اب کچھ کہو گے منہ سے تو ہوگا مجھے بھی غم
سنتے تھے تم جو کہتے تھے عباس با حشم　　دو جا کے ان کو تہنیت عہدۂ علم
صدقے گئی خلاف ادب کچھ سخن نہ ہو
میری خوشی یہ ہے کہ جبیں پر شکن نہ ہو

بچوں کے لئے دودھ کی قسم سے بڑی کوئی قسم نہیں ہوتی یہ حربہ بلکہ حق ماں اس وقت استعمال کرتی ہے جب اسے کسی خاص امر میں پس و پیش کا گمان ہو۔ بہر حال علم کا قضیہ ختم ہوا تو ماں نے بچوں میں شجاعت اور خاندانی جلالت کا ذکر کر کے انہیں نامی گرامی پہلوانوں پر فتحیاب ہونے کے لئے آمادہ کر لیا کہ تم تو ''جعفر سے نمو دار کے دلبر ہو دلیرو'' اس لئے اب میدان میں جاؤ اور ''تیروں سے جوانوں کے جگر توڑ کے آؤ/ خیبر کی طرح کوفہ کا در توڑ کے آؤ'' کہ اسی میں ناموری ہے۔ ناقدین انیس اس بات پر متفق ہیں کہ انیس ایک باکمال شاعر ہے جس نے سانحۂ کربلا سے متصل ان تمام آفاقی قدروں کو شعری قالب عطا کر دیا جس کا کوئی ثانی نہیں۔

ان کے حساس ذہن و دل نے اس واقعہ کو نہ صرف دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا بلکہ اسے مشاہدات و تجربات کی آنچ میں تپا کر ایسا کندن بنایا کہ اس کی چمک آج بھی باقی ہے اور اس میدان میں کوئی بھی ان سے آگے نہ جا سکا۔ خواہ وہ رشتوں کا پاس و لحاظ ہو کہ حفظ مراتب کا خیال، بھائی سے بھائی کی محبت، بہن بھائی کا پیار، ماں بیٹے کی محبت، بزرگوں کا احترام، چھوٹوں سے پیار، دوستوں کی وفاداری، عالم شباب میں بہادری کے کارنامے حتیٰ کہ انکساری اور رواداری سمیت بے شمار پہلوؤں کے حوالے سے انیس نے اپنے قلم سے انسان سازی کی ایسی مہم

چھیڑ دی کہ جس سے سبق لے کر ہم آج بھی خیر و شر کی شناخت الگ الگ خانوں میں کر سکتے ہیں اور پھر ایک اہم فیصلہ کے تحت خیر کے ہم نوا بنتے دکھائی دیتے ہیں، اس کا ساتھ دیتے نظر آتے ہیں۔

مراثی کے حوالے سے دیکھا جائے تو واقعہ کربلا نے نہ صرف ہند۔اسلامی تہذیب کو متاثر کیا ہے بلکہ اس کی تشکیل میں بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔میر انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک عظیم موضوع کو اپنے عہد کی ضرورتوں کے مطابق اپنے سماج کی ترجمانی کے لئے اپنا لیا۔اس میں اخلاق و کردار کے،انسان سازی کے اہم ترین نکات پیش کر دئے کہ جس کی نظیر اردو کے شعری کائنات میں اور کہیں نہیں ملتی۔ایسے میں ان کا ساتھ ان کی فصاحت و بلاغت، زبان و بیان، سادگی و سلاست و روانی، صنائع و بدائع اور تشبیہات و استعارات وغیرہ شعری Tools نے تو دیا ہی ان کی پرورش و پرداخت نے بھی اس اہم مرحلے پر ان کا بخوبی ساتھ نبھایا کہ آج اسی کی بدولت مراثی انیس کا شمار آفاقی ادب کے طور پر ہوا کرتا ہے۔

✿✿✿✿✿

انفارمیشن ٹکنالوجی۔لمحۂ فکریہ

ڈاکٹر طارق سجاد الیکٹرونکس انجینئر، سینئر منیجر، کول انڈیا

سکریٹری مرکز ادب و سائنس، رانچی۔

''انفارمیشن''(Information) اور کمیونی کیشن (Communication) یہ دو الفاظ آج کے تیزی سے بدلتے ہوئے ترقی یافتہ تکنیکی عہد کے ایسے منتر بن گئے ہیں جس سے نہ صرف پورے انسانی معاشرہ کو بلکہ انفرادی زندگی کی حرکات وسکنات اور طرز غور و فکر کو بھی ایک حد تک متاثر کر دیا ہے۔آج ہم جس سوسائٹی میں سانس لے رہے ہیں وہ پوری طرح سے معلوماتی معاشرہ (Information Society) میں تبدیل ہو چکا ہے۔اب کسی بھی ملک کی ترقی کا پیمانہ صرف یہ نہیں ہے کہ وہ صنعت وحرفت میں کتنا آگے ہے یا اس کے یہاں کی پیداوار اور سروس کا معیار کتنا اونچا ہے بلکہ جدید پیمانہ یہ ہے کہ اس کے یہاں کی انفارمیشن ٹکنالوجی کتنی اعلیٰ وارفع ہے اور اس کا مواصلاتی نظام کتنا منظم اور متحرک ہے۔معلومات یعنی انفارمیشن ہی آج علم (Knowledge) کی بنیاد بن چکا ہے اور یہی علم دراصل ہمہ جہتی ترقی کا ضامن ہے۔

آج کسی بھی ملک کا معلوماتی نظام اس کے مواصلاتی نظام پر منحصر ہے۔جو مواصلاتی نظام معلومات کو جتنی آسانی اور سہولت کے ساتھ لوگوں تک پہنچا سکتا ہے، وہ اتنا ہی معیاری تسلیم کیا جاتا ہے۔آپ چاہے ڈاکٹر ہوں یا انجینئر، سائنس داں ہوں یا مفکر و دانشور، بیروکریٹ ہوں یا ٹیکوکریٹ، آپ کی جو بھی حیثیت ہو اگر معلومات آپ کی انگلیوں کے اشارے پر رقصاں ہیں (Information are at your finger tips) تو آپ معلومات کی شاہراہ پر گامزن ہیں اور آپ مادی ترقی کی منزلوں کو حاصل کرنے کے اہل ہیں۔ برخلاف اس کے اس معلوماتی انقلاب (Info-revolution) اور معلوماتی لہر (Info-wave) نے آپ کو متاثر نہیں کیا ہے تو آپ اس مسابقتی دوڑ میں یقیناً خطرہ کی زد میں ہیں۔

انسانی زندگی کی سوچ فکر کو جس ایک شے نے پچھلی دو دہائی میں سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ ہے

"کمپیوٹر" (Computer)۔اسی کمپیوٹر کی تکنیک نے مواصلاتی نظام کو اس قدر تیز رفتار کر دیا ہے کہ دنیا کی تمام معلومات ہماری انگلیوں کے چند اشاروں پر کھیلنے لگ گئی ہیں۔ دراصل "انفارمیشن ٹکنالوجی" اور "انٹرنیٹ" (Internet) اسی کمپیوٹر کی مرہون منت ہے۔آج دنیا بھر میں تقریباً ایک ارب سے زائد کمپیوٹر ایک نٹ ورک کی شکل میں انٹرنیٹ سے جڑے ہوئے ہیں اور۔۔۔۔پل پل کی معلومات بہم کرا رہے ہیں۔

کمپیوٹر نے کمیونی کیشن ٹکنالوجی اور انفارمیشن ٹکنالوجی کو ایک نیا رخ دیا ہے۔آج ہمارے لیے ملک کی سرحدیں بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں اور ساری دنیا ایک عالمی گاؤں (Global Village) میں تبدیل ہو گئی ہے۔یہ بات بالکل لایعنی ہو گئی ہے کہ کوئی بھی معلومات آپ اپنے کسی پڑوسی یا آس پاس کے گھر سے حاصل کر رہے ہیں یا دور کسی دوسرے براعظم کے کسی گمنام خطے سے! کیوں کہ انفارمیشن سپر ہائی وے نے کمپیوٹر نٹ ورک کی مدد سے سالوں کے فاصلے کو لمحوں میں تبدیل کر دیا ہے۔

اس انفارمیشن ٹکنالوجی نے کئی ایسی قیمتی تکنیکی خدمات (Value aided services) کو فروغ دیا ہے جس نے انسانی زندگی میں غیر معمولی تغیر پیدا کر دیا ہے۔ایسی خدمات میں چند قابل ذکر نام اس طرح ہیں:

الیکٹرونک میل (E-Mail)، وی۔سیٹ ٹکنالوجی (V-SAT Technology)، موبائیل / سیلولر فون (Mobile/Cellular Phone)، ریڈیو پیجنگ (Radio Paging)، ریڈیو ٹرنکنگ (Radio Trunking)، ویڈیو کانفرسنگ (Video Conferencing)، انٹرنیٹ (Internet)، انٹرانیٹ (Interanet)، کلاؤڈ کمپیوٹنگ (Cloud Computing)، واٹس ایپ (Whats App)، فیس بک (Face book)، ٹویٹر (Twitter)، انٹرنیٹ آف تھنگس (I.O.T.) وغیرہ۔ان کی بدولت آج معلومات ہر جگہ، ہر وقت بلا تامل میسر ہیں۔انفارمیشن ٹکنالوجی نے گویا وقت کی سوئی کی رفتار کو اپنے قابو میں کر لیا ہے چنانچہ برسوں اور مہینوں کی معلومات کو چند سیکنڈوں میں قابل حصول بنا دیا ہے۔

انٹرنیٹ یا ربطال کو آج ساری دنیا معلومات کا سرچشمہ تسلیم کرچکی ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ انٹرنیٹ معلومات کا وہ اتھاہ سمندر ہے جس میں سمندر کی بے شمار لہروں کی طرح معلومات کی بے پناہ لہریں موجزن ہیں، ہر تیراک جسے اپنا واضح ہدف معلوم ہو وہ سمندر کی بے شمار لہروں سے لڑتا ہوا معلوماتی سمندر کی تہہ تک پہنچتا ہے اور وہاں سے قیمتی اور نایاب موتی نکال لاتا ہے۔ البتہ جس تیراک نے اپنا قطعی ہدف سمندر میں اترنے سے پہلے طے نہیں کیا ہے وہ گھنٹوں سمندر کی ان بے شمار لہروں سے جھوجھتا اور ٹکراتا ہوا بغیر موتی حاصل کیے ہوئے نامراد لوٹ آتا ہے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ انٹرنیٹ میں داخل ہو کر آپ بھی واقعی اپنے کام کے موتی ڈھونڈ لاتے ہیں یا محض اس کی سطح پر گھنٹوں ہاتھ پاؤں مار کر خالی ہاتھ لوٹ آتے ہیں۔

یہ تو رہا سکے کا ایک رخ۔ اب آیئے ہم ذرا اس امر پر بھی غور کریں کہ کیا انفارمیشن ٹکنالوجی، موبائیل ٹکنالوجی، کمپیوٹر اور مواصلاتی نظام سے لائی ہوئی یہ مادی خوشحالی ہی سب کچھ ہے اور اسے من وعن بالکل اسی طرح سے آنکھیں بند کر کے تسلیم کرلیا جائے جیسا کہ مغرب اسے حسین لبادے میں پیش کررہا ہے یا ایک مومن ومسلم ہونے کے ناطے اسے تجزیہ کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ اسلام کے نزدیک تمام علوم وفنون کا سرچشمہ سوائے ذات الٰہی کے اور کوئی نہیں ہے اور اسی نے اولاً آدم علیہ السلام کو علم سکھایا۔ لہٰذا ایک مرد مومن کو یہ چاہیے کہ وہ کسی بھی علم وحرفت اور ٹکنالوجی کے حصول، تحقیقی پیش رفت اور استعمال سے پہلے اس کا اندازہ لگانے کی کوشش کرے کہ اس کے مضمرات کیا ہوسکتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انٹرنیٹ کا نظام، الیکٹرونک میل، کمپیوٹر، فیس بک، واٹس ایپ اور ٹویٹر کا بے محابا استعمال انسان کو خود سائنسی حرکیات ومنطق کا غلام بنا کے رکھ دے۔ اور انٹرنیٹ سے معلومات کا خزانہ حاصل کرنے کے شوق میں آپ اخلاقیات کی جڑیں کھوکھلی کرنے والے جراثیم کو اکٹھا کرلیں۔ عین ممکن ہے کہ اس سیلاب علم ومعلومات میں بے شمار لغو، فحش اور غلاظت سے بھرپور مواد آپ کے گھر میں داخل ہو جائے۔ آج یہ امر حقیقی بن چکا ہے کہ انٹرنیٹ اور ای میل کے ذریعہ آپ گھر کے اندر رہ رہ وہ رطب ویابس مہیا کرسکتے ہیں جس کا تصور ایک صالح معاشرہ یا صالح مومن کبھی نہیں کرسکتا۔ اخلاقیات کو بگاڑنے والی فحش تصاویر آج انٹرنیٹ پر آسانی سے دستیاب ہیں کہ جن سے خود مغربی معاشرہ سراسیمہ ہے لیکن اس کے

تدارک کی کوئی تدبیر نہیں ہو پا رہی ہے، یہ لمحۂ فکریہ ہے کہ مستقبل قریب میں کہیں انٹرنیٹ ایک ایسا عالمی شیطانی جال نہ بن جائے کہ معصوم گھروں کو بالکل تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کر دے۔ واٹس ایپ، فیس بک وغیرہ سوشل میڈیا نے جہاں ایک طرف معاشرے کے مختلف افراد کو قریب تر لانے کا کام کیا ہے وہیں دوسری طرف نوجوان نسل کے درمیان بے جا اور بے محابا استعمال (Uncontrolled uses) کی وجہ سے ان کے لیے خودکشی کا باعث بھی بن رہا ہے۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ معلوماتی انقلاب (Info-revolution)، معلوماتی لہر (Info-wave) نے آج درحقیقت معلوماتی جنگ (Info-War) کی صورت اختیار کر لی ہے۔ انٹرنیٹ کا وجود اصلاً اسی خطرے کے پیش نظر عمل میں آیا تھا کہ دشمن جوہری اسلحے کا استعمال اگر کسی ملک مثلاً امریکہ پر کرتا ہے تو اس کے پاس ایک ایسا مواصلاتی نظام لازماً ہو جو اس خطرناک موقع پر بھی اپنا کام کرتا رہے۔ واضح ہو کہ انٹرنیٹ ساٹھ کی دہائی میں امریکہ کا ایک ڈیفنس پراجیکٹ تھا جو روسی حملے کے خطرے کے جواب میں تیار کیا گیا تھا۔ بعد میں جب سرد جنگ (Cold war) کا خاتمہ ہوا اور روس کی طاقت ایک سپر پاور کی حیثیت سے ختم ہو گئی تب امریکہ نے اس انٹرنیٹ کو تعلیم و معیشت کے میدان میں اپنی مادی منفعت کے لیے فروغ دینا شروع کیا۔

آج کا مواصلاتی نظام اور انفارمیشن ٹکنالوجی جس طرح کمپیوٹر نٹ ورک سے جڑا ہوا ہے اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ "بغیر ہتھیار اٹھائے کوئی بھی ملک اپنے دشمن ملک کو انٹرنیٹ کمپیوٹر وائرس اور دوسرے برقیاتی نظاموں کے ذریعے اس کے مربوط اطلاعی ذخیروں اور نظاموں کو تہہ و بالا کر سکتا ہے۔ مگر یہ معلوماتی جنگ اور 'برقیاتی جارحیت' امریکہ یا اس جیسے کسی ترقی یافتہ ملک کے خلاف ہی ممکن ہے جس کا سارا مواصلاتی اور عسکری نظام جدید ترین انفارمیشن ٹکنالوجی کا مرہون منت ہے۔ اس ممکنہ جارحیت کے خلاف موثر ترین دفاع اس کے دانشوروں کے نزدیک یہی ہے کہ دشمن قوت بھی اس طرح کے اعلیٰ ترین 'ترقی یافتہ' مواصلاتی و برقیاتی نظاموں سے لیس ہو جائے تاکہ جنگ اور جارحیت کی صورت میں اسے بھی اس طرح کی جوابی جارحیت کا

امکانی خطرہ ہو''۔ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ امریکہ جس طرح سے بالعموم پوری دنیا بالخصوص مسلم ممالک کو انفارمیشن ٹکنالوجی سے لیس کر رہا ہے اور پوری دنیا اسے آنکھ بند کر کے تسلیم کرتی چلی جارہی ہے یہ یقیناً خطرناک علامت ہے۔ لہٰذا ایک اسلامی اور آزاد ریاست کے پالیسی سازوں کو اس پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنا چاہیے۔

ایک مومن کو اپنی مومنانہ بصیرت سے کام لے کر یہ دیکھنا ہوگا کہ مغرب میں (اور اب ترقی پذیر اور پسماندہ ملکوں میں بھی) جس طرح ثقافت و تہذیب، خاندان اور سماجی رشتوں اور اعلیٰ انسانی اقدار کی پامالی انتہائی تیز رفتاری سے جاری ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اسی انفارمیشن ٹکنالوجی اور مواصلاتی نظام اور سوشل میڈیا کا شاخسانہ ہو۔ اہل نظر کو یہ دیکھنا ہوگا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی بالادستی اور ہمہ جہت اقتدار کے نتیجہ میں جو نظام وجود میں آیا ہے اس کی بنیاد میں کسی فوق الفطرت ہستی کی حاکمیت کے تصور کے لیے کوئی جگہ، روحانیت کے لیے کوئی گنجائش اور اعلیٰ اخلاقی و سماجی اقدار پر یقین کے لیے کوئی امکانی صورت ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو کیا یہ سمجھا جائے کہ خدانخواستہ علیم و خبیر خدا کی جگہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے لے لی ہے اور انسان خود مشین اور مشینی غلام بن کر رہ گیا ہے؟ یہ مسلم سائنس دانوں اور دانشوروں کے لیے آج وقت کا سب سے بڑا چیلنج ہے کہ وہ مصنوعی ذہانت اور اطلاعاتی مشینوں کو کس طرح قابو میں رکھیں کہ یہ ان پر حاوی اور حکمراں ہونے کے بجائے حاکمیت الٰہ کے تصور کو نافذ کرنے اور صالح معاشرے کی تشکیل میں مثبت رول ادا کر سکیں۔

❁❁❁❁❁

مرکز ادب وسائنس تعلیمی وفلاحی ٹرسٹ، رانچی۔ ایک مختصر تعارف

مرکز ادب وسائنس، تعلیمی و فلاحی رجسٹرڈ ٹرسٹ، رانچی، جھارکھنڈ کے فاؤنڈر چیرمین اور ٹرسٹی پروفیسر احمد سجاد نے ۲۵ر نومبر ۱۹۹۵ء کو جب اس ٹرسٹ کو قائم کیا تو ان کے خیال میں سرسید احمد خاںؒ نے انیسویں صدی کے آخر میں مغربی علوم وفنون اور برطانوی سامراجی غلبہ کے نتیجے میں بیسویں صدی کے لیے تعلیم وتدریس کا ایک نیا خاکہ پیش کیا اب جب کہ آواخر بیسویں صدی میں علمی دھماکہ (Knowledge Explosion) عالم گیری اور یونی پولر سامراج سر ابھار چکا ہے تو تعلیم یک رخی ہوتی جارہی ہے۔ چنانچہ اکیسویں صدی کے تناظر میں علم واخلاق کے حسین امتزاج کی بنیاد پر آج پھر ایک نئے نظام تعلیم کی ضرورت محسوس ہورہی ہے تاکہ بڑھتی ہوئی پیشہ وری (Professionalism) اور الحاد ومادہ پرستانہ تعلیم کے یک رخاپن کو عالمی مذاہب کی توحیدی روحانیت کے قیمتی اخلاقی اقدار سے جوڑ کر اسے متوازن، معتدل اور انسانیت نواز بنایا جائے تاکہ فرد کی کلی تربیت (Development of total Personality) سماج کا ہمہ جہت ارتقا اور ریاست کی عمدہ تشکیل ممکن ہوسکے جس کے نتیجے میں آنے والی نسل حق وصداقت، جدت و جرأت اور حسن وخیر سے اپنے کردار کو مالا مال کرکے اپنی خاندانی زندگی کو مستحکم اور قومی زندگی کو منظم کرکے عالمی امن وانصاف کی فضا کو ہموار کرسکے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ: دین ودھرم کی روحانی واخلاقی اقدار کے زیر سایہ دماغی وجسمانی، غرض شخصیت کی ہمہ جہت تشکیل وارتقا کی راہیں ہموار کی جائیں۔ جو آنے والی نسل کے لیے ایجاد واختراع، حق وانصاف اور ہمت وجرأت کے ساتھ فرد کے کردار میں حسن وجاذبیت، خاندانی زندگی میں اعتدال وہم آہنگی اور قومی زندگی میں نظم وارتباط کی راہ ہموار کرسکیں گی۔ لہذا جب قوموں کے درمیان نظم وارتباط قائم ہوجائے تو سارے عالم میں اس سے امن وشانتی اور خوش حالی آسکے گی۔ چنانچہ مرکز ادب وسائنس کے ہم کم مایہ ٹرسٹیز کوشاں ہیں کہ اوروں سے ذرا الگ سوچیں، نادیدہ راہوں کو تلاش کریں اور کچھ نیا پیش کریں تاکہ نت نئے مسائل کو حل کرنے میں معاون ہوکر سرخرو ہوں۔

ان اغراض کی تکمیل کے لیے مرکز ادب وسائنس ٹرسٹ کے چار شعبے قائم کیے گئے:

(۱) ادبیات (Literature)(۲) مذاہب کا تقابلی مطالعہ(Study of Comparative Religions)(۳) کیریئر گائیڈنس اینڈ ٹریننگ (Career Guidance and Training) اور(۴) تحقیق واشاعت(Research and Publication)

تا کہ زبان وادب کی قوت تسخیر سے انسانی قلوب کو آمادہ وتیار کیا جائے کہ مختلف مذاہب نے پوری انسانی تاریخ میں جو اخلاق و روحانی اقدار کا قیمتی ورثہ چھوڑا ہے انہیں عملی زندگی میں اختیار کیا جائے۔ نیز انسانی ذہن ودماغ نے جو مادی علوم وسائنس اور ٹکنالوجی کا قیمتی خزانہ پیش کیا ہے اس پر مزید فکر وتحقیق کے ساتھ انسانی زندگی کو پر امن اور خوش حال بنایا جائے۔

چنانچہ فاؤنڈر چیرمین نے اپنی عمر بھر کی کمائی سجاد لائبریری جو تقریباً سترہ ہزار قیمتی کتابوں پر مشتمل ہے۔ بڑا گائیں میں واقع ایک چھ کٹھہ زمین کے ساتھ اس ٹرسٹ کو وقف کر دیا۔ جس کے نتیجے میں بُرودے اور رمانجھی اور پسکا نگڑی میں ٹرسٹ کے لیے ڈھائی ایکڑ زمین خریدی گئی۔ اور ہر یا تو ہاؤسنگ کالونی، رانچی میں اپنی رہائش گاہ کے ایک گیریج نما ہال (۴۰۰ مربع فٹ) میں قومی کونسل کے یک سالہ کمپیوٹر ڈپلوما کورس سے کام کی شروعات ہو گئی۔ پھر تو دھیرے دھیرے مختلف سرکاری اداروں اور یونیورسٹیوں کے کئی اسٹڈی سنٹرس قائم ہو گئے۔ مثلاً اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، نئی دہلی (اگنو)، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد (مانو) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL)، ڈوییک(DOEACC/NIELIT)اور ان، سی، وی، ٹی (NCVT)وغیرہ۔ گزشتہ پندرہ برسوں میں تقریباً سولہ ہزار طلبا و طالبات ٹرسٹ کے مختلف کورسوں کو مکمل کر کے رانچی، جھارکھنڈ، ملک اور بیرون ملک میں برسر روزگار ہو چکے ہیں۔ جس کا مختصر تذکرہ پیش خدمت ہے:۔

<u>پچھلے صرف ایک سال کی تعلیمی کارکردگی</u> ۱۳-۲۰۱۲ء کی سالانہ رپورٹ کے مطابق مرکز ادب و سائنس کی دسیوں چھوٹی بڑی تعلیمی یونٹوں (انسٹی ٹیوٹس) میں داخلہ لینے والے کل طلبا/طالبات کی تعداد ۵۲۹۴ تھی، جس کا اجمالی خاکہ اس طرح ہے:

☆ صرف رانچی ضلع کی آئی، ٹی، آئی طلبا کے لیے DOEACC کی BCC ٹریننگ میں: ۱۰۹۲

☆ اسی کورس کے پانچ ضلعی شاخوں (صاحب گنج، رام گڑھ، بوکارو، دمکا اور ہزاری باغ) میں: ۲۴۵

☆ صرف رانچی ضلع میں DOEACC کی طرف سے کمپیوٹر .I.T پروجیکٹس کے دس کورسوں میں مفت داخلہ لینے والے شیڈول کاسٹ، شیڈول ٹرائب اور اقلیتی طلبا کی کل تعداد: ۶۲۰

☆ DOEACC الکٹرونکس ری پیر اینڈ مین ٹے نینس (Electronics Repair and Maintenance) کورس کی ہزاری باغ شاخ میں: ۲۶۰، اور پاکوڑ میں: ۳۷۷

☆ DOEACC, ITES-BPO ٹریننگ کی گملا شاخ میں: ۳۶۶، صاحب گنج شاخ میں: ۵۰۷ اور ڈالٹن گنج شاخ میں: ۱۳۰

☆ حکومت ہند کے محکمہ DGET سے ٹرسٹ کی رانچی شاخ SIIT کو VTP کے سنٹر کی منظوری حاصل ہوگئی ہے، جس کے تحت ICT میں پانچ کورس، بزنس اینڈ کامرس میں دو کورس اور NCVT کے سافٹ اسکل سیکٹر کے ایک کورس میں تعلیم وتربیت کا آغاز ہو چکا ہے۔

☆ SIIT رانچی شاخ نے نیشنل کونسل فار ووکیشنل ٹریننگ (NCVT) کی مندرجہ ذیل بیس اضلاع میں اس سال فروری سے تعلیم وتربیت شروع کردی ہے۔ بوکارو، رام گڑھ، ڈالٹن گنج، دھنباد، لوہردگا، جمشید پور، دمکا، دیوگھر، جام تاڑا، پاکوڑ، گڑھوا، گریڈیہہ، گوڈا، گملا، ہزاری باغ، چترا، سمڈیگا، کھونٹی، کوڈرما اور صاحب گنج۔

☆ ٹرسٹ اور سرکاری ذرائع سے مختلف مراحل کے ۶۶ طلبا/طالبات کو پچھلے سال کل مبلغ 4,38,647 روپیے کے وظائف سے مدد کی گئی۔

☆ مرکز ادب وسائنس اور برج کیشور نیتر ہین (نابینا) بالیکا ودیالہ کے اشتراک سے بڑا گائیں، رانچی میں بلا امتیاز مذہب وملت نابینا لڑکیوں کے لیے مفت قیام وطعام کے ساتھ میٹرک، 2+ (بذریعہ NIOS) اور دوسالہ خصوصی کمپیوٹر کی ٹریننگ کا مفت نظم قائم کیا جا چکا ہے۔

☆ بینا لڑکیوں کے لیے NIOS سے میٹرک اور 2+ کے ساتھ حکومت ہند کے یک سالہ کمپیوٹر ڈپلوما کورس بذریعہ NIELIT Ministry of IT اور قومی کونسل (NCPUL Ministry of HRD) کے

کورسوں میں تیرہ مفت نصابی کتابوں کے ساتھ داخلہ کا آغاز ہو چکا ہے۔

☆ الامین مشن مغربی بنگال کے اشتراک سے ''سوپر 30 اور رحمانی 30 '' کے طرز پر ''الامین مرکز 30 رانچی'' کا بھی آنے والے سیشن سے آغاز کار کی تیاریاں بحمداللہ مکمل ہو چکی ہیں۔

☆فرقہ وارانہ ہم آہنگی (Communal Harmony)مذاہب عالم کی مقدس کتابوں کی اخلاقی اقدار اور زبان وادب کی اہمیت وافادیت پر وقتاً فوقتاً (الف)قومی سمینار منعقد کئے گئے:۔

(۱) ''مختلف مذاہب کی مقدس کتابوں میں انسانی اقدار''۔

(۲) ''مختلف مذاہب میں عدم تشدد، امن اور روحانی فکر وعمل'' پر قومی سمینار منعقدہ ۱۰/اپریل ۲۰۰۸ء۔

(۳) ''جھارکھنڈ میں اردو شاعری اور نثر کی سمت ورفتار ۱۹۶۰ء کے بعد''۔ منعقدہ ۲۰۱۱ء

(۴) ''اخلاقی قدروں کے فروغ میں اردو ادب کا حصہ''۔ منعقدہ ۱۴/اپریل ۲۰۱۳ء وغیرہ

(ب)ٹرسٹ کے شعبہ تحقیق واشاعت کے تحت متعدد کتابیں شائع ہوئیں:۔

(۱) ''ہندوستان کا جدید تعلیمی انقلاب اور مسلم اقلیت''۔ از پروفیسر احمد سجاد ۲۰۰۰ء

(۲) ''تعلیم اور روزگار کے نئے مواقع''۔ انجینئر طارق سجاد۔ سکریٹری ٹرسٹ ۲۰۰۰ء

(۳) ''بندۂ مومن کا ہاتھ'' (سوانح حیات مولانا علی حسین عاصم بہاری جدوجہد آزادی کے ایثار پیشہ مجاہد اور بانی تحریک آل انڈیا مومن کانفرنس) مصنفہ۔ پروفیسر احمد سجاد ۲۰۱۱ء

(۴) ''جھارکھنڈ میں اردو شاعری اور نثر کی سمت ورفتار ۱۹۶۰ء کے بعد''۔ مجموعہ مقالات۔ مرتبہ پروفیسر احمد سجاد۔ ۲۰۱۲ء

(۵) ''جنوبی ہند کا ایک علمی وادبی سفر''۔ مصنفہ پروفیسر احمد سجاد ۲۰۱۳ء

(۶) ''اکیسویں صدی کے تناظر میں ملی تعلیمی ایجنڈا''۔ مصنفہ پروفیسر احمد سجاد ۲۰۱۳ء

(۷) ''کیا برصغیر کی اردو آبادی عذاب مسلسل کا شکار ہے؟''۔ ستمبر ۲۰۱۳ء وغیرہ

(ج) تین زیر تحقیق وترتیب موضوعات:۔

(i) ''ہندوستانی ادبیات کی فکری وفنی بنیادیں'' (بحوالہ خصوصی اردو اور ہندی)

(ii) ''مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی کا مسئلہ۔ پنچایت سے پارلیمنٹ تک''۔

(iii) ''تعلیم کا مستقبل''۔

ٹرسٹ نے غریب طلباو طالبات کی مالی امداد کے مد میں سے مفت کتابوں کی تقسیم کے علاوہ اپنے ذرائع سے اب تک تقریباً ۱۸ لاکھ روپے کی خطیر رقم وظائف میں تقسیم کیے۔ اسی طرح جھارکھنڈ اور بہار کی غریب ترین دیہی آبادی کے بچوں کی طبی جانچ، ویکسی نیشن اور دواؤں کی تقسیم کے لیے تیرہ مڈیکل کیمپ منعقد کیے گئے اور تعلیمی بیداری مہم چلائی گئی۔ جس سے مستفیض ہونے والوں کی جملہ تعداد تقریباً نو ہزار ہے۔

عنقریب بروے اور مانجھی میں انشاً اللہ ایک ہائی اسکول کی تعمیر شروع ہونے والی ہے جہاں سنڈے اور سمر اسکول بھی چلانے کی اسکیم ہے۔ جس کے بعد دیگر علوم وفنون کے کالجز کے قیام کے ساتھ ایسی یونیورسٹی کے قیام کا خاکہ بھی پیش نظر ہے جہاں روایتی کے ساتھ فاصلاتی (Distance)اور آن لائن تعلیمی نظام کے ذریعہ گاؤں بلوک اور اضلاع سے لیکر ریاست گیر پیمانے پر صد فی صد خواندگی کی تحریک بھی شروع کی جائے۔ مدارس اسلامیہ کو جدید تعلیمی و تدریسی تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے فاصلاتی تعلیم سے بھی اسے جوڑنے کی کوشش ہو۔ اور بحیثیت مجموعی جملہ علوم وفنون کو حتی الوسعی اخلاق مندانہ بنایا جائے۔ پوری توقع ہے کہ مرکز ادب و سائنس تعلیمی و فلاحی ٹرسٹ کے زیر اہتمام اس تعلیمی تحریک میں بلاتفریق مذہب وملت اور فرقہ و مسلک اہل علم، اہل خیر اور اہل الرائے حضرات کا دامے درمے، قدمے اور سخنے ہر طرح کا تعاون و اشتراک حاصل رہے گا۔ اقبال کے اس آفاقی پیغام کو ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ:۔

؎ جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

؎ جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ (اقبالؔ)

IBLAGH

HALF YEARLY

پروفیسر احمد سجاد کی چند اہم تصانیف

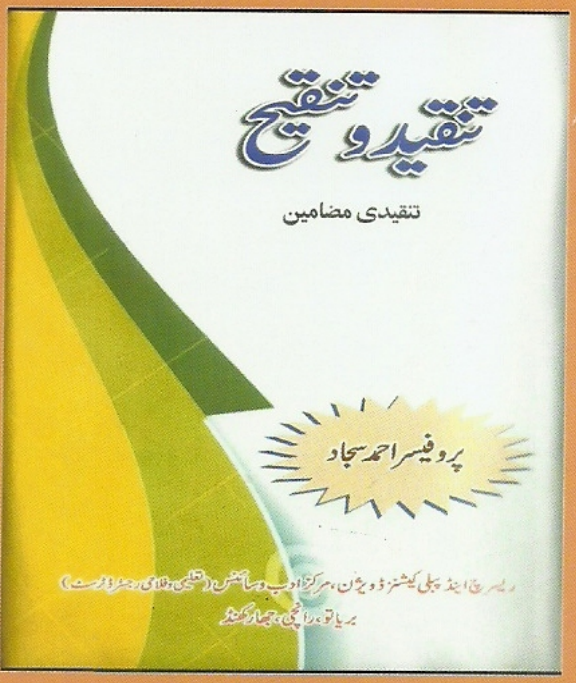

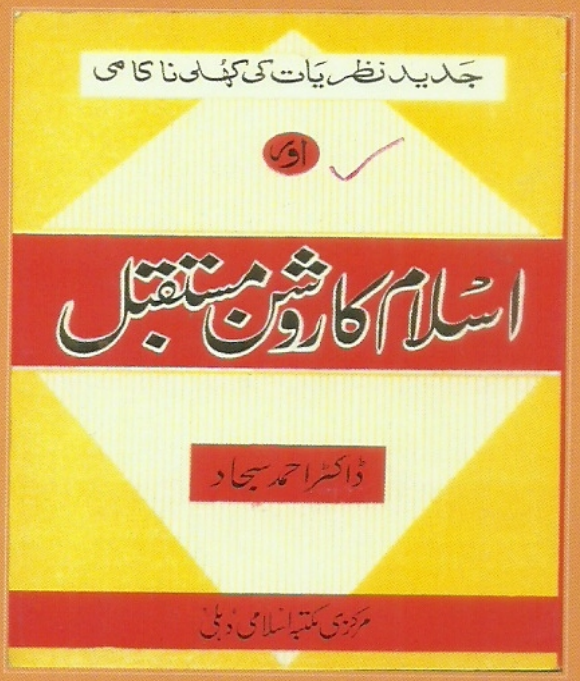

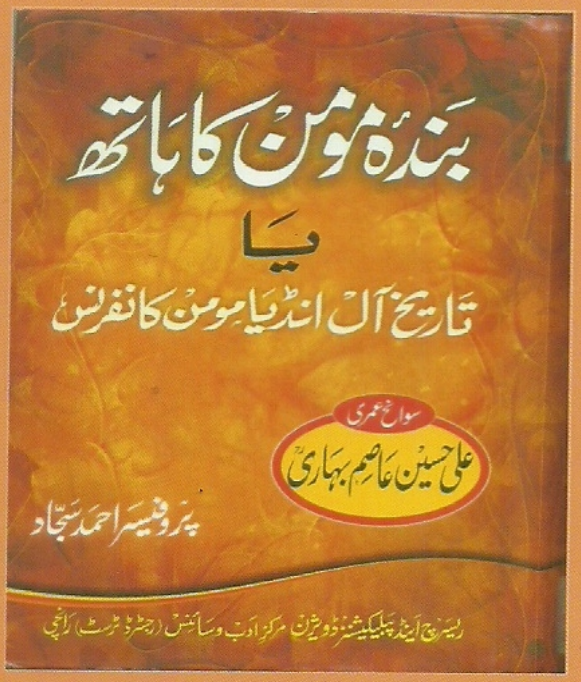

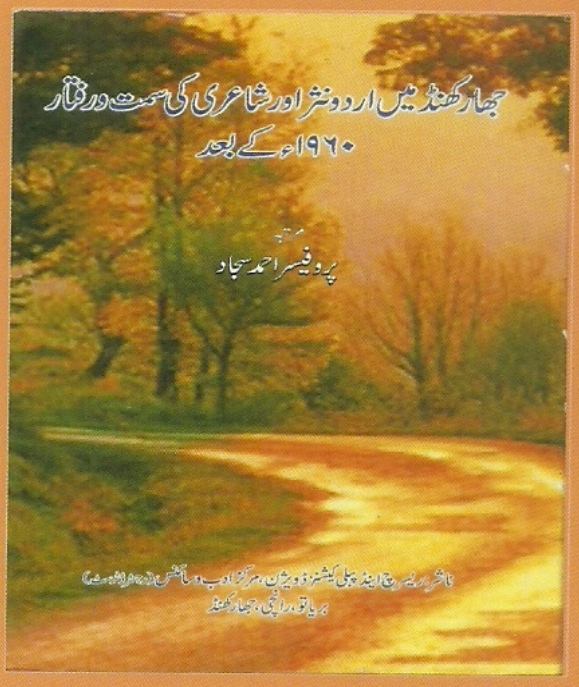

ملنے کا پتہ: دفتر ابلاغ ۲ ک/۳، ہاوسنگ کالونی، ڈاکخانہ آر، ایم، سی، سی، بریاتو، رانچی۔ ۸۳۴۰۰۹

Printed by Hamara Press, Mob.9334424709